الرسالہ

Al-Risala

November 2001 • No. 300 • Rs. 10

خدایا مجھے چیزوں کو ویسا ہی دکھا
جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں
نہ کہ ویسا جیسا کہ
میں انھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن (مکمل)	400.00	اسلام: ایک عظیم جدوجہد	5.00	دین انسانیت	60.00
مطالعۂ سیرت	60.00	تاریخ دعوت حق	5.00	فکر اسلامی	50.00
اسباق تاریخ	85.00	مطالعہ سیرت (کتابچہ)	12.00	شتم رسول کا مسئلہ	50.00
تعمیر حیات	60.00	ڈائری (جلد اول)	80.00	طلاق اسلام میں	5.00
تعمیر انسانیت	50.00	کتاب زندگی	65.00	مضامین اسلام	60.00
سفرنامہ (غیرملکی اسفار، جلد اول)	95.00	اقوال حکمت	25.00	حیات طیبہ	7.00
سفرنامہ غیرملکی اسفار، جلد دوم	125.00	تعمیر کی طرف	10.00	باغ جنت	7.00
اسلام: ایک تعارف	80.00	تبلیغی تحریک	20.00	نار جہنم	7.00
اللہ اکبر	60.00	تجدید دین	25.00	سچا راستہ	8.00
پیغمبر انقلاب	50.00	عقلیاتِ اسلام	35.00	دینی تعلیم	7.00
مذہب اور جدید چیلنج	65.00	قرآن کا مطلوب انسان	25.00	خلیج ڈائری	10.00
عظمت قرآن	35.00	دین کیا ہے؟	7.00	رہنمائے حیات	7.00
عظمت اسلام	60.00	اسلام دین فطرت	25.00	تعدد ازواج	7.00
عظمت صحابہ	7.00	تعمیر ملت	7.00	ہندستانی مسلمان	60.00
دین کامل	80.00	تاریخ کا سبق	7.00	روشن مستقبل	7.00
الاسلام	45.00	فسادات کا مسئلہ	5.00	صوم رمضان	7.00
ظہور اسلام	50.00	انسان اپنے آپ کو پہچان	5.00	اسلام کا تعارف	5.00
اسلامی زندگی	40.00	تعارف اسلام	5.00	علماء اور دور جدید	20.00
احیاء اسلام	35.00	اسلام پندرہویں صدی میں	5.00	سفرنامہ اسپین و فلسطین	60.00
راز حیات	65.00	راہیں بند	12.00	مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	12.00
صراطِ مستقیم	40.00	ایمانی طاقت	7.00	سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	10.00
خاتونِ اسلام	60.00	اتحاد ملت	7.00	یکساں سول کوڈ	5.00
سوشلزم اور اسلام	50.00	سبق آموز واقعات	7.00	اسلام کیا ہے؟	8.00
اسلام اور عصر حاضر	30.00	زلزلہ قیامت	10.00	میوات کا سفر	35.00
الربانیۃ	40.00	حقیقت کی تلاش	12.00	قیادت نامہ	35.00
کاروانِ ملت	45.00	پیغمبر اسلام	5.00	منزل کی طرف	5.00
حقیقت حج	30.00	آخری سفر	10.00	اسفار ہند	125.00
اسلامی تعلیمات	35.00	اسلامی دعوت	7.00	ڈائری ۹۰-۱۹۸۹	100.00
اسلام دور جدید کا خالق	25.00	حل یہاں ہے	10.00	قال اللہ و قال الرسول	70.00
حدیث رسول	40.00	امہات المومنین	25.00	ڈائری ۹۲-۱۹۹۱	90.00
راہ عمل	25.00	تصویر ملت	85.00	مطالعۂ قرآن	80.00
تعبیر کی غلطی	80.00	دعوت اسلام	50.00	مذہب اور سائنس	40.00
دین کی سیاسی تعبیر	25.00	دعوت حق	40.00		
عظمتِ مومن	7.00	نشری تقریریں	80.00		

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ، نومبر 2001

فہرست

پاک کو ناپاک سے جدا کرنا	4	توبہ کا کرشمہ	28
اخلاقی زہر	5	جنت کا ٹکٹ	29
روح دین	6	صحیح رخ	30
جنت کی نعمتیں	7	لاعیش الاعیش الآخرۃ	31
خوش خبری	8	خدا اور بندہ	32
زلزلہ کا سبق	9	بھلانے کی ضرورت	33
آگ سے بچاؤ	10	انسان کدھر	34
ایک نشانی	11	انذار آخرت	35
پہلے آپ	12	نازک پارسل	36
امتحان کے لیے	13	زندگی کی کھیتی	37
رہبانیت	14	ہر ایک کی کہانی	38
موت	15	کہاں سے کہاں	39
غلطی میری نہیں	16	فیض بقدر استعداد	40
سچی خوشی	17	علم اور تقوی	41
پندرہ منٹ میں	18	حسد کے بچاؤ دعا	42
دو بول	19	موت کے بعد	43
اہل جنت	20	یہ انسان	44
صرف ایک بار	21	دو گروہ	45
رضوان اللہ رضوان العباد	22	حرص اور قناعت	46
ایک تاثر	23	عاجز انسان	47
فہرست آرزو	24	سب سے بڑی بھول	48
منصوبہ تخلیق	25	ایک تاثر	49
مستقبل پکار رہا ہے	26		

الرسالہ
Al-Risala

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel. 435 6666, 435 1128 Fax 435 7333, 435 7980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES

Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 460
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY

IPCI: ISLAMIC VISION
434, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137 • Fax 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY

AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
5601 SW 106th Ave,
Cooper City, FL 33328 U.S.A.
Tel. (954) 4348404 • Fax (954) 4342551
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi- 110 051.

پاک کو ناپاک سے جدا کرنا

ما کان اللہ لیذر المومنین علی ما انتم علیہ حتی یمیز الخبیث من الطیب وما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب ولکن اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء فآمنوا باللہ ورسلہ وان تومنوا وتتقوا فلکم اجر عظیم (آل عمران ۱۷۹)

اللہ وہ نہیں کہ چھوڑ دے مسلمانوں کو جس طرح پر تم ہو جب تک جدا نہ کرے ناپاک کو پاک سے۔ اور اللہ یوں نہیں کہ تم کو خبردار کر دے غیب کے اوپر۔ بلکہ اللہ چھانٹ لیتا ہے اپنے رسولوں میں جس کو چاہے۔ پس تم یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر۔ اور اگر تم یقین پر رہو اور پرہیزگاری کرو تو تم کو بڑا ثواب ہے۔

اللہ کی نظر میں کون اچھا ہے اور کون برا، اس کا حال اسی دنیا میں کھل جاتا ہے۔ مگر اس کا اندازہ معمول کے حالات میں نہیں ہوتا، بلکہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ غیر معمولی حالات پیش آئیں۔ جب کہ انسان کو اپنے سانچہ کو توڑ کر اور اپنی زندگی کی روش کو بدل کر اس بات کا ثبوت دینا ہو کہ وہ فی الواقع اللہ پر یقین رکھتا ہے اور اس کی پکڑ سے ڈرنے والا ہے۔ ایک آدمی کے ساتھ جب کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آتا ہے تو یہ اللہ کی طرف سے اس کے امتحان کا وقت ہوتا ہے۔ اللہ اس کو ایک معاملاتی جانچ میں ڈال کر دیکھتا ہے کہ وہ خدا سے ڈرنے والا ہے یا اس کے سینہ میں ایسا دل ہے جو اللہ کے خوف سے خالی ہے۔ معاملہ کے وقت وہ بے انصافی کرتا ہے یا انصاف سے کام لیتا ہے۔ وہ ڈھٹائی کے راستہ پر چلتا ہے یا اعتراف کے راستہ پر۔ وہ گھمنڈ کا طریقہ اختیار کرتا ہے یا تواضع کا۔ وہ خدا کے حکم کو نظر انداز کرتا ہے یا اس کے آگے جھک جاتا ہے۔ جب بھی آدمی اپنے آپ کو اس قسم کے دو امکانات کے درمیان پائے تو اس کو سمجھنا چاہئے کہ اس کے رب نے اس کو پل صراط پر کھڑا کر دیا ہے جو بال سے زیادہ باریک ہے۔ ایک طرف اگر وہ جھکتا ہے تو وہ جہنم میں جا گرے گا اور دوسری طرف جھکتا ہے تو جنت میں اپنے آپ کو پائے گا۔

کون خدا کی نظر میں کیا ہے، اس کا اعلان فرشتوں کے ذریعہ نہیں کرایا جاتا۔ اس معاملہ میں اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان انسانوں میں سے ایک انسان کو کھڑا کرتا ہے اور اس کے ذریعہ سے حق کی آواز کو بلند کرتا ہے۔ اس آواز کو ماننے یا نہ ماننے میں آدمی کا سب سے بڑا امتحان ہوتا ہے۔ اپنے جیسے ایک انسان کی بولی میں خدا کی آہٹ کو پا لینا اپنے جیسے ایک انسان کی آواز میں حق کی تجلیات کو پہچان لینا، یہی اللہ کی نظر میں آدمی کا اصل کمال ہے، جو اس کمال کا ثبوت دے وہ اللہ کی نظر میں پاک انسان ہے، اس کے لئے جنت کی سرسبز بستیاں ہیں۔ اور جو لوگ اس جانچ میں ناکام رہیں وہ اللہ کی نظر میں ناپاک لوگ ہیں۔ دنیا میں خواہ وہ کتنے ہی کامیاب نظر آئیں۔ مگر آخرت میں دوزخ کی آگ کے سوا کوئی چیز نہ ہوگی جہاں ان کو ٹھکانا مل سکے۔ آدمی صالح ہے یا غیر صالح، اس کا فیصلہ معمول کے حالات میں نہیں ہوتا بلکہ غیر معمولی حالات میں ہوتا ہے۔ اس کی انصاف پسندی اس وقت کھلتی ہے جب کہ وہ اپنے مخالف سے معاملہ کر رہا ہو۔ اس کی حق طلبی اس وقت معلوم ہوتی ہے جب کہ حق کی آواز اس کو ایک ایسے گوشہ سے سنائی دے جس طرف اس کا گمان نہیں گیا تھا۔

اخلاقی زہر

۶ جنوری ۱۹۹۰ کو دہلی (شکرپور) میں ایک دردناک واقعہ ہوا۔ کچھ چھوٹے بچے ایک میدان میں کھیل رہے تھے۔ وہاں ایک طرف کوڑے کا ڈھیر تھا۔ وہ کھیلتے ہوئے اس کوڑے تک پہونچ گیے۔ یہاں انھیں ایک پڑی ہوئی چیز ملی۔ یہ کوئی زہریلی چیز تھی۔ مگر انھوں نے بے خبری میں اس کو اٹھا کر کھالیا۔ اس کے نتیجہ میں دو بچے فوراً ہی مر گیے، اور آٹھ بچوں کو تشویشناک حالت میں جے پرکاش نرائن اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ یہ بچے دو سال سے پانچ سال تک کے تھے۔

ٹائمس آف انڈیا (۷ جنوری ۱۹۹۰) نے صفحۂ اول پر اس کی خبر دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ان بچوں میں سے ایک نے وہاں ایک چھوٹا پیکٹ پایا۔ اس میں تقریباً ڈیڑھ سو گرام کوئی سفید رنگ کا سفوف تھا۔ انھوں نے غلطی سے اس کو شکر سمجھا اور آپس میں تقسیم کر کے کھانے لگے۔ کھانے کے چند منٹ بعد ان کے ہونٹ نیلے پڑ گیے:

One of them found a small packet containing about 150 gm of white, powdery substance. They mistook it for sugar and distributed it among themselves. Within minuters of consuming it, their lips turned blue.

مادی خوراک کے اعتبار سے یہ چند بچوں کا واقعہ ہے۔ لیکن اخلاقی خوراک کے اعتبار سے دیکھیے تو آج یہی تمام انسانوں کا واقعہ ہے۔ آج کی دنیا میں تمام انسان ایسی اخلاقی غذائیں کھا رہے ہیں جو ان کی انسانیت کے لیے زہر ہیں، جو ان کو ابدی ہلاکت سے دوچار کرنے والی ہیں۔

جھوٹ، بدکاری، رشوت، غرور، حسد، الزام تراشی، ظلم، غصب، بددیانتی، وعدہ خلافی، بدخواہی، بے اصولی، بدمعاملگی، انانیت، بے اعترافی، غلطی نہ ماننا، احسان فراموشی، خودغرضی، انتقام، اشتعال انگیزی اپنے لیے ایک چیز پسند کرنا اور دوسرے کے لیے کچھ اور پسند کرنا، یہ تمام چیزیں اخلاقی معنوں میں زہریلی غذائیں ہیں۔ آج تمام لوگ ان چیزوں کو میٹھی شکر سمجھ کر کھا رہے ہیں۔ مگر وہ وقت زیادہ دور نہیں جب ان کا زہریلا پن ظاہر ہوگا۔ اور پھر انسان اپنے آپ کو اس حال میں پائے گا کہ وہاں نہ کوئی اس کی فریاد سننے والا ہوگا اور نہ کوئی اس کا علاج کرنے والا۔

روح دین

ایک سفر کے دوران مجھے ایک ایسے ملک میں جانا پڑا جہاں پہلے بادشاہی نظام تھا۔ اب بادشاہ کا خاتمہ ہوگیا۔ اب وہاں صدر راج قائم ہے۔ قدیم شاہی محل کی تمام شان و شوکت باقی ہے۔ البتہ اب اس کو شاہی محل کے بجائے صدارتی محل کہا جاتا ہے۔

میں اور کانفرنس کے دوسرے شرکاء صدر مملکت سے ملاقات کے لیے صدارتی محل میں لے جائے گئے۔ ہم لوگ جب اس پُر ہیبت عمارت میں داخل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ ہر آدمی کا انداز اچانک بدل گیا ہے۔ لوگوں پر خاموشی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ ان کی رفتار سست پڑ گئی۔ چہرے پر سنجیدگی کے آثار ظاہر ہو گئے۔ محل کی ہر چیز کو وہ پُر رعب نظروں سے دیکھنے لگے۔

اس منظر کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں، وہ بھی خدا کا ایک عظیم محل ہے۔ اس میں ہر طرف خدا کی عظمت و قدرت کے جلوے نمایاں ہیں۔ اس خدائی محل کے اندر چلتے ہوئے مزید اضافہ کے ساتھ آدمی پر وہ کیفیت طاری ہونا چاہیے جو کسی شاہی محل کے اندر چلتے ہوئے اس کے اندر طاری ہوتی ہے۔

مگر جب میں دنیا کے راستوں میں لوگوں کو چلتے ہوئے دیکھتا ہوں تو یہ محسوس کر کے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ یہاں لوگ اس طرح چل رہے ہیں گویا کہ انھیں اس عظیم حقیقت کی کوئی خبر ہی نہیں۔ لوگوں کے چہروں پر خشوع جھلکتا ہوا نظر نہیں آتا جو از روئے واقعہ ان کے چہروں پر جھلکنا چاہیے۔

لوگوں کے چہروں پر مجھے احتیاط کے بجائے غفلت نظر آتی ہے۔ ان کی چال تواضع کے بجائے سرکشی کی چال معلوم ہوتی ہے۔ ان کے انداز پر ذمہ داری کے بجائے بے حسی کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔ خدا کی دنیا میں چلتے ہوئے لوگ اتنا سنجیدہ بھی نظر نہیں آتے جتنا کوئی شخص کسی ایوان صدارت یا کسی قصر شاہی میں چلتے ہوئے نظر آتا ہے۔

جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ انسانی محل میں چلتے ہوئے ان پر ہیبت طاری ہو مگر خدائی محل میں چلتے ہوئے ان پر ہیبت طاری نہ ہو وہ خدا کی رحمت سے آج ہی دور ہو گئے۔

جنت کی نعمتیں

اُکیدر بن عبدالملک الکندی (م ۱۲ھ) دومۃ الجندل کا عیسائی حاکم تھا۔ غزوہ تبوک (۹ ھ) میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس کے مقام کے قریب پہونچے تو وہ آکر آپ سے ملا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ مگر آپ کی وفات کے بعد وہ پھر گیا۔ خلیفہ اول کے زمانہ میں حضرت خالد بن الولید رضؓ نے اس سے جنگ کی جس میں وہ مارا گیا۔

روایات میں آتا ہے کہ اُکیدر جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لیے آیا تو اس کے جسم پر نہایت شاندار لباس تھا۔ حضرت انس بن مالک رضؓ کہتے ہیں :

رأیت قباء اکیدر حین قدم بہ علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجعل المسلمون یلمسونہ بایدیھم ویتعجبون منہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : اتعجبون من ھذا، فوالذی نفسی بیدہ لمنادیل سعد بن معاذ فی الجنۃ احسن من ھذا۔

(البدایۃ والنہایۃ ۵/ ۱۷)

میں نے اکیدر کی قبا اس وقت دیکھی ہے جب کہ وہ اس کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ مسلمان اس کی قبا کو اپنے ہاتھ سے چھونے لگے اور اس پر تعجب کرنے لگے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا تم لوگ اس پر تعجب کر رہے ہو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، بلاشبہ جنت میں سعد بن معاذ کے رومال اس سے بھی زیادہ اچھے ہیں۔

جس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت ابدی ہے اسی طرح آپ کا یہ کلام بھی ابدی ہے۔ آپ کا یہ قول صرف پہلی صدی ہجری کے ایک خوش پوش انسان کے بارے میں نہیں ہے بلکہ قیامت تک کی ان تمام دنیوی چیزوں کے بارہ میں ہے جن کی ظاہری رونق پر لوگ تعجب کریں اور جن کو دیکھنے والے رشک کی نظروں سے انھیں دیکھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی جو چیزیں لوگوں کو آج بہت خوش نما نظر آتی ہیں، جنت کی چیزیں ان کے مقابلہ میں بے حساب گنا زیادہ خوش نما اور پُر راحت ہوں گی۔ اس وقت آدمی کو محسوس ہوگا کہ جو کچھ اس نے کھویا وہ کچھ بھی نہ تھا، جب کہ اس نے جو کچھ پایا ہے وہ سب کچھ سے بھی بہت زیادہ ہے۔

خوش خبری

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب امر حق کا اعلان کیا تو آپ کو وہاں کے لوگوں کی طرف سے سخت اذیت اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

آپ کی اہلیہ خدیجہ بنت خویلد فوراً ہی آپ پر ایمان لے آئیں۔ اب تک وہ آپ کی زندگی میں شریک تھیں، اب وہ آپ کی مصیبتوں میں شریک ہوگئیں۔ مخالفین آپ کے گرد جمع ہوکر شور مچاتے طرح طرح سے آپ کو ستانے کی تدبیریں کرتے۔

یہی حالات تھے کہ ایک روز خدا کے فرشتہ جبریل آپ کے گھر آئے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ خدیجہ کو ان کے رب کی طرف سے سلام پہنچا دیجئے۔ اس کے بعد جبریل نے کہا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں خدیجہ کو ایک ایسے گھر کی خوش خبری دے دوں جو موتیوں کا ہے، وہاں نہ شور ہے اور نہ تکلیف (أُمِرتُ أَنْ أُبَشِّرَ خَدِيجَةَ بِبَيْتٍ مِن قَصَبٍ لَاصَخَبَ فِيهِ وَلَانَصَبَ) سیرۃ ابن ہشام ۱/۲۵۱

یہ حضرت خدیجہ کے لیے بشارت ہے اور عام اہل ایمان کے لیے نصیحت۔ خدیجہ کے لیے وہ کامیابی کی پیشگی خبر تھی اور دوسروں کے لیے وہ کامیابی کی طرف رہ نمائی۔

مومن کو موجودہ دنیا میں سرکش انسانوں کی طرف سے اذیتیں پیش آتی ہیں۔ ان کا شور اور ان کے اشتعال انگیز الفاظ سننے پڑتے ہیں۔ ایسے موقع پر مومن کو یہ نہیں کرنا ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے لڑنے لگے۔ اس کے برعکس مومن کو چاہیے کہ وہ ان کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی توجہ آخرت کی طرف موڑ دے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے کہے کہ خدایا، مجھے ان ناخوش گواریوں پر صبر کی توفیق دے اور میرے لیے جنت میں ایک ایسا گھر بنا دے جہاں نہ کوئی تکلیف ہو اور نہ کسی قسم کا شور وغل۔

دنیا میں ایک آدمی خدا پرستی کا پیغام لے کر کھڑا ہو، اور انسان پرست لوگ اس سے بگڑ کر اس کے خلاف شور وغل کریں۔ وہ اللہ کے لیے عمل کرنے کی طرف پکارے۔ مگر لوگ اس کو ستانے اور پریشان کرنے کے درپے ہو جائیں۔ ان سب کے باوجود وہ صبر کرے تو ایسے شخص کے لیے اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ اس کو اگلی دنیا میں قیام کرنے کے لیے ایسا نفیس ماحول دے گا جہاں وہ ابدی طور پر شور اور تکلیف دونوں سے محفوظ رہ کر پُر راحت زندگی گزار سکے۔

زلزلہ کا سبق

قدرتی آفتوں میں سب سے بڑی آفت زلزلہ ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے انسان زلزلوں کا شکار ہوتا رہا ہے۔ زلزلہ میں جو انسانی موتیں واقع ہوتی ہیں، ان کا سب سے بڑا سبب مکانوں کا گرنا ہے۔ جب زلزلہ کا جھٹکا آتا ہے تو مکانات اچانک گر پڑتے ہیں اور چھوٹے بڑے سب اس کے نیچے دب کر مر جاتے ہیں۔ انسان نے اپنے تجربات میں یہ معلوم کیا کہ جو مکان جتنا زیادہ مضبوط ہو، اتنی ہی آسانی سے وہ زمین بوس ہو جاتا ہے اور بھیانک حادثات کا سبب بنتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ زلزلہ سے پیدا ہونے والے نقصانات سے بچنے کی تدبیر مکانات کی "مضبوطی" نہیں بلکہ اس کی "کمزوری" ہے۔ مضبوط مکان بے لچک ہوتا ہے، وہ زلزلہ کے مقابلہ میں مستحکم طور پر کھڑا رہنا چاہتا ہے۔ چوں کہ شدید زلزلہ کا جھٹکا ہر مضبوط مکان سے بہت زیادہ ہوتا ہے، اس لیے مکان کی مضبوطی اس کے لیے الٹی پڑتی ہے۔ وہ پورا کا پورا دھڑام سے گر جاتا ہے۔

اس کے برعکس مکان اگر زیادہ مضبوط نہ ہو بلکہ لچک دار ہو تو اس کے اندر زلزلہ کے جھٹکے کو سہارنے کی طاقت آجاتی ہے۔ زلزلہ جب جھٹکا دیتا ہے تو وہ خود بھی ہلنے لگتا ہے۔ اس طرح مکان کا ہلنا اس کو گرنے سے بچا لیتا ہے۔ زلزلہ اگر زمین کو تلپٹ نہ کرے، بلکہ صرف ہلائے، تو ایسے مکانات اکثر محفوظ رہتے ہیں اور اسی کے ساتھ ان مکانوں کے باشندے بھی۔

اس تجربہ کی روشنی میں ارتھ کوئیک انجینیرنگ وجود میں آئی ہے۔ اس انجینیرنگ کے مطابق، زلزلہ کے علاقوں میں ایسے مکانات بنائے جاتے ہیں جن کا ڈھانچہ فلوٹنگ فاؤنڈیشن کے اصول پر بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ جب زلزلہ کا جھٹکا آتا ہے تو ایسا مکان ہل کر رہ جاتا ہے، وہ منہدم نہیں ہوتا۔ ۱۹۸۹ میں سان فرانسسکو میں شدید زلزلہ آیا۔ مگر وہاں صرف ۲۷۵ موتیں ہوئیں۔ جب کہ جون ۱۹۹۰ میں اسی قسم کا زلزلہ شمالی ایران میں آیا تو ۴۰ ہزار آدمی مر گئے۔ اس فرق کا سبب یہ تھا کہ سان فرانسسکو میں لچک دار مکانات بنے ہوئے تھے اور ایران میں اینٹ اور سمنٹ کے مضبوط مکانات۔

یہ قدرت کا ایک سبق ہے جو بتاتا ہے کہ موجودہ حادثات کی دنیا میں بچنے کی تدبیر کیا ہے۔ وہ تدبیر یہ ہے کہ آدمی اس دنیا میں اکڑ کے ساتھ نہ رہے بلکہ تواضع کے ساتھ رہے۔

آگ سے بچاؤ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ پہونچے تو وہاں آپ نے سب سے پہلے ایک مسجد بنائی جو مسجد نبوی کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں آپ نے جو پہلا جمعہ پڑھا، اس میں آپ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

اے لوگو، اپنے لیے کچھ آگے بھیجو۔ جان لو کہ خدا کی قسم تم میں سے ہر شخص موت کا نشانہ بنے گا۔ پھر وہ اپنی بکریوں کو اس حال میں چھوڑ کر چلائے گا کہ ان کا کوئی چرواہا نہ ہوگا۔ پھر اس کا رب اس سے کلام کرے گا اور وہاں کوئی ترجمان نہ ہوگا۔ اور نہ درمیان میں کوئی پردہ ہوگا۔ وہ فرمائے گا کہ کیا تمہارے پاس میرا فرستادہ نہیں آیا جس نے تم کو میرا پیغام پہونچایا۔ اور میں نے تم کو مال دیا اور تمہارے اوپر اپنا فضل کیا۔ پھر تم نے اپنے آگے کے لیے کیا بھیجا۔ بندہ اپنے دائیں اور بائیں دیکھے گا۔ مگر وہ کچھ نہ پائے گا۔ پھر وہ اپنے سامنے دیکھے گا۔ تو وہاں جہنم کے سوا اور کچھ نہ دیکھے گا۔ پس جو شخص اپنا چہرہ آگ سے بچا سکے وہ بچائے، خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ کیوں نہ ہو (البدایۃ والنہایۃ، ۲۱۴/۳)

آدمی کے اندر موت اور قیامت کے مسئلہ کا شدید احساس پیدا ہو جائے تو وہ چاہنے لگتا ہے کہ جو بھی قیمت وہ دے سکتا ہے، اس کو دے کر وہ اپنے آپ کو آخرت کے عذاب سے بچائے۔

رات کے وقت وہ بستر پر لیٹا ہوا ہے۔ آخرت کے مسئلہ کو سوچ کر وہ تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ اٹھ کر وضو کرتا ہے اور نماز کے لیے کھڑا ہو کر کہتا ہے کہ خدایا، میری اس نماز کو میری طرف سے قبول کرلے اور مجھے آگ کے عذاب سے بچالے۔ وہ ایک شخص کو مصیبت میں دیکھتا ہے، وہ اپنی محنت کی کمائی کا ایک حصہ اس کو دیتا ہے اور اس کا دل کہہ رہا ہوتا ہے کہ خدایا، آج میں نے جس طرح اس کی مدد کی ہے، تو آنے والے سخت تر دن میں میری مدد فرما۔ ایک حق اس کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اپنی پوزیشن کا خیال کیے بغیر اس کا اعتراف کرلیتا ہے اور آنسوؤں کی زبان سے کہتا ہے کہ خدایا، مجھے اپنے ان بندوں میں لکھ لے جنھوں نے دیکھے بغیر تیرا اعتراف کیا۔

ہر عمل، کھجور کا ایک ٹکڑا ہے، اور جس آدمی کے پاس جو ٹکڑا ہے، اس کو چاہیے کہ اسی ٹکڑے کو وہ اپنی نجات کے لیے پیش کرے۔

ایک نشانی

پچھلے روز ایک لیڈر کا انتقال ہوگیا۔ آج ٹی وی پر اس کے حالات دکھائے گئے۔ اتفاق سے مجھے اس کو دیکھنے کا موقع ملا۔ کل کے اخبار میں میں نے اس کے انتقال کی خبر پڑھی تھی۔ آج میں نے ٹی وی اسکرین پر دیکھا کہ وہ چل رہا ہے۔ وہ تقریر کر رہا ہے۔ وہ لوگوں سے ملاقات اور بات چیت کر رہا ہے۔ اس طرح دیر تک ٹی وی پر اس کی زندگی دکھائی دیتی رہی۔

اس کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ ٹی وی مجھ سے یہ کہہ رہا ہو کہ جس آدمی کو تم نے سمجھا تھا کہ وہ مر گیا، وہ مرا نہیں۔ وہ اب بھی زندہ حالت میں موجود ہے۔ وہ اب بھی ٹھیک اسی طرح زندہ ہے جیسا کہ وہ موت کا واقعہ پیش آنے سے پہلے زندہ تھا۔ اگر تم کو "ٹی وی" کی نگاہ حاصل ہو جائے تو آج بھی تم اس کو پہلے کی طرح چلتے پھرتے دیکھ سکتے ہو۔

ٹی وی خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ وہ نہ دکھائی دینے والی حقیقتوں کو دکھا رہا ہے۔ وہ آج محدود طور پر ان چیزوں کو ظاہر کر رہا ہے جو آئندہ مکمل طور پر تمام لوگوں کے سامنے ظاہر ہو جائیں گی۔ وہ گویا کل مشاہدہ سے پہلے حقائق کا جزئی مشاہدہ ہے۔

آدمی دنیا میں پیدا ہوتا ہے، وہ بچے سے بڑا ہوتا ہے۔ صبح و شام کی صورت میں اس کے دن گزرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کا آخر وقت آجاتا ہے۔ وہ دنیا کے ماحول سے نکال لیا جاتا ہے تاکہ اس کو آخرت کے ماحول میں بسایا جائے اور اس کے اعمال کے مطابق اس کی ابدی زندگی کا فیصلہ کیا جائے۔

ہر وہ شخص جو پیدا ہوا ہے، وہ ضرور ایک دن موت سے دوچار ہوگا۔ اور موت کے بعد ضرور وہ آخرت کی دنیا میں داخل کیا جائے گا جہاں اس کو خدا کی عدالت میں اپنا مکمل حساب دینا پڑے۔ جس طرح زندگی یقینی ہے، اسی طرح موت یقینی ہے۔ اور جس طرح موت یقینی ہے، اسی طرح قیامت اور آخرت کا معاملہ بھی یقینی ہے۔ آدمی اس سے بھاگ نہیں سکتا، البتہ وہ تیاری کر کے اس کی سختیوں سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ دانش مند وہ ہے جو آج کے اندر کل کو دیکھ لے۔ جو آج کے واقعہ میں اپنے کل کے لیے نصیحت حاصل کر لے۔

پہلے آپ

ڈاکٹر سوجات موکو انڈونیشیا کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ پروفیسر تھے۔ وہ جکارتا یونیورسٹی میں ایک علمی موضوع پر لکچر دے رہے تھے۔ عین لکچر کے دوران ان پر دل کا دورہ پڑا۔ وہ اسٹیج ہی پر گر پڑے اور اسی وقت وفات پاگیے۔ وہ پہلے ایشیائی تھے جو اقوام متحدہ کی امن یونیورسٹی (ٹوکیو) کے پریسیڈنٹ مقرر ہوئے۔ انھوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں:

Prof Dr. Soedjatmoko, one of the leading intellectuals of Indonesia while delivering a lecture at a University campus, in Jogjakarta, had a heart attack, collapsed and expired. He was the first Asian to become the President of UN's Peace University in Tokyo. He has written a number of books.

ڈاکٹر سوجات موکو کا کیس موجودہ دنیا میں ہر آدمی کا کیس ہے۔ پریس اور میڈیا اور پلیٹ فارم کے ظہور نے ہر آدمی کو بولنے کے لامتناہی مواقع دیدیئے ہیں۔ ہر آدمی صبح و شام بولنے میں مصروف ہے۔

آج ہر آدمی دوسروں کو سنا رہا ہے۔ حالاں کہ خدا کے بھیجے ہوئے فرشتے ہر آدمی کی طرف آرہے ہیں تاکہ اس کو لے جاکر وہاں کھڑا کردیں جہاں اس کو صرف سننا ہے، سنانے کا موقع آخری طور پر اس کے لیے ختم ہو چکا ہے۔

علم لفظوں سے واقفیت کا نام نہیں ہے بلکہ معانی سے واقفیت کا نام ہے۔ اس دنیا میں سب سے بڑا کام بولنا نہیں ہے بلکہ سب سے بڑا کام چپ رہنا ہے۔ یہاں اصل اہمیت اظہار رائے کی نہیں ہے بلکہ اظہار رائے سے پہلے سوچنے کی ہے۔

بولنے والا حقیقۃً وہ ہے جو اپنے آپ سے بولے۔ بتانے والا وہ ہے جو اپنے دماغ کو سوچنے میں لگائے ہوئے ہو۔ دوسروں کو نصیحت کرنے والا وہ ہے جو دوسروں کو نصیحت کرنے سے پہلے اپنے آپ کو نصیحت کرے، جو دوسروں کو مخاطب کرنے سے پہلے اپنا مخاطب خود بن جائے۔ جو دوسروں پر بلڈوزر چلانے کا نعرہ لگانے سے پہلے خود اپنی ذات پر بلڈوزر چلا چکا ہو۔

دوسروں کو مخاطب کرنا سب سے آسان کام ہے اور اپنے آپ کو مخاطب کرنا سب سے مشکل۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس راز کو جانتے ہوں۔

امتحان کے لیے

امتحان ہال میں طالب علم کو بہت سی چیزیں ملی ہوئی ہوتی ہیں ـــــ بلڈنگ، میز، کرسی، ملازم کاغذ اور بہت سی دوسری چیزیں۔ وہ بلا روک ٹوک ان چیزوں کا استعمال کرتا ہے۔ وہ آزادانہ طور پر ان کے درمیان اپنی نشست پر بیٹھتا ہے۔

بلڈنگ اس کو سردی اور گرمی سے بچاتی ہے۔ میز اور کرسی اس کو آرام کے ساتھ بیٹھنے کی جگہ فراہم کرتے ہیں۔ کاغذ اور دوسرے سامان اس کو موقع دیتے ہیں کہ وہ جس طرح چاہے ان کو استعمال کرے اور جو چاہے کاغذ کے صفحہ پر رقم کرے۔

مگر یہ سب کچھ جو طالب علم کو ملتا ہے وہ امتحان کے طفیل میں ملتا ہے۔ وہ صرف اس وقت تک کے لیے اس کا ہے جب تک امتحان کی مدت پوری نہ ہو جائے۔ جیسے ہی امتحان کی مدت ختم ہوتی ہے اس سے وہ سب کچھ چھین لیا جاتا ہے جو اس کو اب تک بے روک ٹوک ملا ہوا تھا، جو دیکھنے والوں کو اس کا ذاتی اثاثہ دکھائی دے رہا تھا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ موجودہ دنیا میں انسان کا ہے۔ یہاں آدمی کو بظاہر بہت سی چیزیں ملی ہوئی ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ آزاد ہے کہ جس طرح چاہے یہاں رہے اور جس طرح چاہے اپنی ملی ہوئی چیزوں کو استعمال کرے۔

مگر یہاں جو کچھ انسان کے پاس ہے وہ سب امتحان کے طفیل میں ہے۔ خدا موجودہ دنیا میں آدمی کا امتحان لے رہا ہے۔ اور اس امتحان کے تقاضے کے تحت وہ بہت سی ضروری چیزیں انسان کو دے دیتا ہے۔ مگر یہ آدمی کے پاس صرف اس وقت تک ہے جب تک امتحان کی مدت ختم نہ ہو جائے۔ امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی اچانک اس سے سب کچھ چھن جائے گا۔ وہ آدمی جو آج بظاہر سب کچھ پائے ہوئے ہے وہ اس وقت بالکل بے کچھ ہو جانے گا۔ اس دن وہ اس مسافر کی طرح ہوگا جس کو اچانک لق و دق صحرا میں ڈال دیا جائے۔ وہ اس انسان کی طرح ہوگا جس کو لامتناہی خلا میں بالکل بے سہارا چھوڑ دیا جائے۔

موجودہ حالت اور اگلی حالت کے درمیان صرف موت کی غیر مرئی دیوار حائل ہے۔

رہبانیت

ثم قفینا علیٰ اٰثارھم برسلنا وقفینا بعیسیٰ ابن مریم واٰتیناہ الانجیل وجعلنا فی قلوب الذین اتبعوہ رأفۃ ورحمۃ ورھبانیۃ نِ ابتدعوھا ما کتبناھا علیھم الا ابتغاء رضوان اللہ فما رعوھا حق رعایتھا

(الحدید ۲۷)

پھر ہم نے ان کے نقشِ قدم پر اپنے رسول بھیجے اور انھیں کے نقشِ قدم پر عیسیٰ بن مریم کو بھیجا اور ہم نے اس کو انجیل دی۔ اور جن لوگوں نے اس کی پیروی کی ان کے دلوں میں ہم نے شفقت اور رحمت رکھ دی۔ اور رہبانیت کو مسیحیوں نے خود نکالا، ہم نے اس کو ان پر نہیں لکھا تھا۔ ہم نے ان کے اوپر صرف اللہ کی رضا چاہنا فرض کیا تھا۔ پھر انھوں نے اس کی پوری رعایت نہ کی۔

اس آیت میں رہبانیت سے مراد یہ ہے کہ آدمی خدا کے نام پر دنیا کو چھوڑ دے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات وہی تھیں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہیں۔ مگر حضرت مسیح کے دو سو سال بعد ان کے پیروؤں میں بگاڑ آگیا۔ ان کا ایک طبقہ رہبانیت میں پڑ گیا۔ وہ لوگ دنیا کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں چلے گیے اور دنیوی چیزوں سے بے تعلق ہو کر شدید قسم کی مشقت برداشت کرنے لگے۔ (تفصیل کے لیے انسائیکلو پرٹانیکا، جلد ۱۲، مقالہ (Monasiticism)

ان کا یہ ترکِ دنیا مذہب کے معاملہ میں غلو اور تشدد سے پیدا ہوا۔ ان کو زہد کی تعلیم دی گئی تھی جس کا مطلب نفسیاتی زہد تھا۔ مگر انھوں نے نفسیاتی زہد کے حکم کو جسمانی زہد کا حکم قرار دے لیا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ دنیا میں مشغول ہو مگر دنیا کو مطلوب و مقصود نہ بناؤ۔ مگر انھوں نے مطلوبیتِ دنیا کی نفی کو مشغولیتِ دنیا کی نفی کے ہم معنی سمجھ لیا۔ یہی ہے حکم خداوندی کی صحیح رعایت نہ کرنا۔

مومن انسانوں کے درمیان زندگی گزارتا ہے مگر اس کی توجہ خدا کی طرف لگی رہتی ہے۔ وہ بظاہر مادی کام میں مشغول دکھائی دیتا ہے۔ مگر اس کا ذہن روحانی سطح پر سرگرم رہتا ہے۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے ایک ایسا انسان بن جاتا ہے جو آخرت میں بسیرا لیے ہوئے ہو۔

موت

موت کیا ہے، موت معلوم دنیا سے نامعلوم دنیا کی طرف چھلانگ ہے۔ موت "اپنی دنیا" سے نکل کر "دوسرے کی دنیا" میں جانا ہے۔ کیسا چونکا دینے والا ہے یہ واقعہ۔ مگر انسان کی یہ غفلت کیسی عجیب ہے کہ وہ اپنے چاروں طرف لوگوں کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے، پھر بھی وہ نہیں چونکتا۔ حالاں کہ ہر مرنے والا زبان حال سے دوسروں کو بتا رہا ہے کہ جو کچھ مجھ پر گزرا یہی تمہارے اوپر بھی گزرنے والا ہے۔

آدمی پر وہ دن آنے والا ہے جب کہ وہ کامل بے بسی کے ساتھ اپنے آپ کو خدا کے فرشتوں کے حوالہ کر دے۔ موت کا واقعہ ہر آدمی کو اسی آنے والے دن کی یاد دلاتا ہے۔

موت کا حملہ سراسر یک طرفہ حملہ ہے۔ یہ طاقت اور بے طاقتی کا مقابلہ ہے۔ اس میں انسان کے بس میں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ کامل عجز کے ساتھ فریق ثانی کے فیصلہ پر راضی ہو جائے۔ وہ یک طرفہ طور پر شکست کو قبول کرلے۔

موت انسانی زندگی کے دو مرحلوں کے درمیان حدّ فاصل ہے۔ موت آدمی کو موجودہ دنیا سے اگلی دنیا کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ اختیار سے بے اختیاری کی طرف سفر ہے۔ یہ امتحان کے بعد اس کا انجام پانے کے دور میں داخل ہونا ہے۔

موت سے پہلے کی زندگی میں آدمی صداقت کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ معقولیت کے آگے جھکنے پر راضی نہیں ہوتا۔ موت اس لیے آتی ہے کہ اس کو بے یار و مددگار کر کے حق کے آگے جھکنے پر مجبور کر دے۔ جس صداقت کو اس نے باعزت طور پر قبول نہیں کیا تھا اس کو وہ بے عزت ہو کر قبول کرے۔ جس حق کے آگے وہ اپنے ارادہ سے نہیں جھکا تھا۔ اس حق کے آگے مجبورانہ طور پر جھکے اور اس کی تردید کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے۔

انسان آج حق کی تائید میں چند الفاظ بولنا گوارا نہیں کرتا، جب موت آئے گی تو وہ چاہے گا کہ ڈکشنری کے سارے الفاظ حق کی موافقت میں استعمال کر ڈالے، مگر اس وقت کوئی نہ ہوگا جو اس کے الفاظ کو سنے۔ انسان آج ڈھٹائی کرتا ہے، موت جب اس کو پچھاڑے گی تو وہ سراپا عجز و نیاز بن جائے گا، مگر اس وقت کوئی نہ ہوگا جو اس کے عجز و نیاز کی قدر دانی کرے۔

غلطی میری نہیں

اڈولف ہٹلر (۱۹۴۵ - ۱۸۸۹) کی موت کے بعد سے اب تک اس کے بارہ میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی تعداد صرف انگریزی زبان میں تقریباً ۵۵ ہزار ہے۔ اس میں تازہ اضافہ برلن کا بنکر (The Berlin Bunker) ہے جو لندن سے چھپی ہے۔ ہٹلر کے آخری ۱۰۵ دن بنکر (فوجی تہ خانہ) میں گزرے تھے۔ مصنف نے اس زمانہ کے ہٹلر کے ساتھیوں سے معلومات حاصل کرکے یہ کتاب مرتب کی ہے۔ ۱۶ جنوری ۱۹۴۵ کو جب ایک ہزار امریکی بمباروں نے برلن کو تہس نہس کر دیا تو ہٹلر اپنے عملہ کے ساتھ خاموشی سے بنکر کے اندر چلا گیا۔ اس زمانہ میں اس کا اتنا برا حال تھا کہ ۵۵ سال کا ہوکر وہ ۷۰ سال کا دکھائی دینے لگا۔ اس کو ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ روس کی بڑھتی ہوئی فوجیں پہنچ کر اس کو پکڑ لیں گی۔ ان حالات میں ایک ایک شخص اس کا ساتھ چھوڑتا گیا۔ یہاں تک آخر میں صرف اس کا کتا اس کے ساتھ رہ گیا۔

ہٹلر کی حکومت چونکہ شروع سے آخر تک تشدد پر قائم تھی اس لیے ہٹلر کو ہر وقت اپنی موت کا شبہ لگا رہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ۴۵ - ۱۹۳۹ کے درمیان ہٹلر کے اوپر ۲۵ بار قاتلانہ حملے ہوئے۔ مگر ہر بار وہ بچ جاتا تھا۔ اس کی وجہ اس کا زبردست حفاظتی عملہ نہ تھا۔ بلکہ ہٹلر کا یہ مزاج تھا کہ وہ اکثر بالکل آخر وقت میں اپنا پروگرام بدل دیتا تھا۔ پروفیسر ہاف من کا کہنا ہے کہ ہٹلر بعض اوقات اپنا پروگرام طے کرنے کے لیے سکّہ اچھالتا اور اس کو دیکھ کر فیصلہ کرتا۔

تاہم اس کے ساتھیوں کا کہنا ہے کہ آخر وقت تک ہٹلر نے یہ نہ کہا کہ "میں نے غلطی کی"۔ وہ ہمیشہ اپنے جنرلوں اور یہودیوں اور کمیونسٹوں کو ساری باتوں کا الزام دیتا رہا۔ حتیٰ کہ "اپنے عوام" کو بھی۔ مایوسی جب اپنی آخری حد پر پہونچ گئی تو ہٹلر نے سائنائڈ کیپسول کھا کر خودکشی کر لی (۶ جنوری ۱۹۸۰)

دنیا میں کوئی آدمی اپنی غلطی کو نہیں مانتا، حتیٰ کہ ہٹلر جیسا آدمی بھی نہیں جس کو تمام دنیا غلط قرار دے چکی ہو۔ آدمی کو معلوم نہیں کہ ایک وقت آنے والا ہے جب کہ وہ اپنی غلطی ماننے پر مجبور ہوگا۔ حتیٰ کہ اگر وہ اپنی زبان سے نہ کہے کہ میں غلطی پر تھا تو خود اس کے اپنے اعضا اس کے خلاف گواہی دیں گے اور وہ اس پر قادر نہ ہوگا کہ ان کو روک سکے (۴۱/۲۱)

سچّی خوشی

الزبتھ ٹیلر (Elizabeth Taylor) جب ۲۸ سال کی عمر کو پہونچی تو وہ امریکہ میں گویا شہزادی بن چکی تھی۔ فوٹو گرافر ہر وقت اس کے پیچھے لگے رہتے تھے۔ اور اس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ اخباروں میں نمایاں طور پر شائع کیا جاتا تھا۔ اس نے چوتھی بار مئی ۱۹۵۹ میں ایڈی فشر (Eddie Fisher) سے شادی کی۔ مگر اب بھی اسے خوشی نہیں ملی۔ ایک ملین ڈالر سے اس نے اپنی مشہور ترین فلم کلیوپترا (Cleopatra) میں ہیروئن کا کردار ادا کرنا شروع کیا۔ مگر عین شوٹنگ کے وقت وہ بے ہوش ہوگئی اور اس کو اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

آج کل سب سے زیادہ شہرت ان لوگوں کو ملتی ہے جو سیاست کے اسٹیج پر یا فلم کے اسٹیج پر ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر سیاست اور فلم کے ان ہیروؤں کے اندرونی حالات نہایت ابتر ہوتے ہیں۔ اخبارات کے صفحات میں یا ٹیلی ویژن کے اسکرین پر تو وہ ہنستے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر ان کی حقیقی زندگی اتنی غمزدہ ہوتی ہے کہ انھیں راتوں کو نیند نہیں آتی۔ ان میں سے اکثر کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ گولیاں کھا کر سوتے ہیں اور جب گولی سے بھی نیند نہیں آتی تو شراب اور منشیات کے ذریعہ غم غلط کرتے ہیں۔

کسی نے کہا کہ "سب سے زیادہ ہنسنے والے چہرے سب سے زیادہ غم گین چہرے ہوتے ہیں"۔ جو شخص اپنے دل کی کیفیت کے تحت ہنسے اس کا ہنسنا واقعی ہنسنا ہوتا ہے۔ مگر سیاسی لیڈر اور فلمی ہیرو وہ لوگ ہیں جو دوسروں کے لیے جیتے ہیں، جو دوسروں کو دکھانے کے لیے بولتے ہیں، ان کا ہنسنا ہمیشہ مصنوعی ہوتا ہے۔

سچی خوشی اس آدمی کے لیے ہے جو خود اپنی ذات میں جینا جانتا ہو۔ جو خود اپنے اندر زندگی کا راز پالے۔ باہر کے لیے جینے والے کبھی سچی خوشی حاصل نہیں کر سکتے۔

مصنوعی خوشی اور حقیقی خوشی میں وہی فرق ہے جو پلاسٹک کے بچہ میں اور زندہ بچہ میں۔ مصنوعی خوشی کا سرچشمہ آدمی کے وجود کے باہر ہوتا ہے۔ اور سچی خوشی کا سرچشمہ آدمی کے وجود کے اندر۔ آدمی اسی چیز سے خوش ہو سکتا ہے جو اندر سے ملے۔ باہر سے ملنے والی چیز کبھی آدمی کو حقیقی خوشی کی نعمت نہیں دے سکتی۔

پندرہ منٹ میں

ٹائمس آف انڈیا (۲ اپریل ۱۹۹۰) میں اوپی نین (Opinion) کے کالم میں مسٹر رتن کیسوانی کی تحریر چھپی ہے۔ وہ اوبرائے ہوٹل (نئی دہلی) میں روم سس ڈویژن منیجر ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ایک خاتون سیاح ان کے ہوٹل میں اتریں۔ جب ٹیکسی انھیں اتار کر چلی گئی تو انھیں یاد آیا کہ ان کا ایک بیگ ٹیکسی میں چھوٹ گیا ہے۔ اس بیگ میں ان کا پاسپورٹ، رقم، کیمرا اور زیورات موجود تھے۔

احتیاطاً انھوں نے ٹیکسی کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ انھوں نے ہوٹل والوں کو بتایا۔ ہوٹل والوں نے فوراً ٹرانک پولیس کے کنٹرول روم کو ٹیلی فون کیا اور ان کو ٹیکسی کا نمبر بتایا۔ کنٹرول روم نے اسی وقت وائرلیس کے ذریعہ پوری دہلی میں سڑکوں پر کھڑی ہوئی پولیس کو اس واقعہ کی خبر دیدی۔ پورے شہر میں ہزاروں نگاہیں گزرتی ہوئی ٹیکسیوں کا معائنہ کرنے لگیں۔ ابتدائی اطلاع کے صرف پندرہ منٹ کے اندر پولیس والوں نے ہوٹل کو بتایا کہ انھوں نے ٹیکسی کو پکڑ لیا ہے اور اس سے مذکورہ بیگ حاصل کر لیا ہے:

Within 15 minutes they telephoned to say
they had located the taxi and taken the bag.

میں نے اس واقعہ کو پڑھا تو مجھے قرآن کی وہ آیت یاد آگئی جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اے جن اور انسان کی جماعت، اگر تم سے ہو سکے تو تم آسمانوں اور زمین کی حدوں سے نکل جاؤ۔ تم نہیں نکل سکتے بغیر (خدا کی) سلطان کے۔ پھر تم اپنے رب کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے۔ تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑا جائے گا تو تم اپنا بچاؤ نہ کر سکو گے۔ (الرحمٰن ۳۴-۳۵)

مخلوق ایسا کر سکتی ہے کہ وہ ترقی یافتہ مواصلات کے ذریعہ فوری طور پر پولیس کو مطلع کرے اور پولیس منٹوں کے اندر بھاگنے والے کا پتہ کر کے اس کو پکڑ لے۔ جب مخلوق کے اندر یہ طاقت ہے تو خالق کے اندر یہی طاقت مزید بے حساب گنا اضافہ کے ساتھ کمال درجہ میں موجود ہوگی۔ آدمی اگر اس پہلو کو سوچے تو اس کی زندگی میں اچانک انقلاب آجائے۔

میں کسی حال میں خدا کی پکڑ سے باہر نہیں، یہی احساس تمام اصلاحات کی جان ہے۔ اس کے بغیر کوئی حقیقی اصلاح ممکن نہیں۔

دو بول

آپ امام البخاری کی " صحیح " کو پڑھنا شروع کریں تو جب آپ اس کے خاتمہ پر پہنچیں گے تو آخر میں آپ کو یہ حدیث لکھی ہوئی ملے گی :

عن ابی ھریرۃ، قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ کَلِمَتَانِ حَبِیْبَتَانِ اِلَی الرَّحْمٰنِ خَفِیْفَتَانِ عَلَی اللِّسَانِ ثَقِیْلَتَانِ فِی الْمِیْزَانِ۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دو بول خدائے مہربان کو محبوب ہیں۔ وہ زبان پر ہلکے ہیں مگر قیامت کی میزان پر بھاری ہیں۔ وہ بول ہیں : سُبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔

اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں بول زمین و آسمان کی تمام چیزوں سے زیادہ وزنی ہیں۔ وہ قیامت میں اعمال کے ترازو کو جھکا دینے والے ہیں۔ مگر ان بولوں کی یہ اہمیت ان کے تلفظ میں نہیں ہے بلکہ ان کی حقیقت میں ہے۔ وہ اس لیے ہے کہ وہ جس معنویت کا اظہار ہیں وہ معنویت اپنی اہمیت میں تمام چیزوں سے بڑھی ہوئی ہے۔

یہ دونوں بول دراصل معرفتِ خداوندی کے بول ہیں۔ ایک شخص کو ایمان کی معرفت حاصل ہوئی۔ اس نے اللہ کی پاک ہستی کا ادراک کیا۔ اس نے دیکھا کہ کائنات اپنے اَن گنت کرشموں کے ساتھ اس کی حمد میں نغمہ سنج ہے۔ اس نے اپنے اندر اور اپنے باہر خدا کی عظمت وجلال کی نشانیاں دیکھیں۔ اس معرفت نے اس کے سینہ میں حمدِ الٰہی اور اعترافِ خداوندی کا طوفان برپا کر دیا۔ وہ بے اختیار پکار اٹھا کہ خدایا تو پاک ہے۔ ساری حمد تیرے لیے ہے۔ تو سب سے زیادہ عظمت والا ہے۔ اس کی زبان پر بے اختیار یہ کلمات جاری ہو گئے کہ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ۔

اس طرح کا ایک بول محض ایک انسانی بول نہیں۔ وہ خدا کی بے پایاں عظمتوں کا انسان کی زبان سے اظہار ہے۔ وہ تمام باوزن چیزوں سے زیادہ باوزن ہے۔ وہ بلاشبہ اسی قابل ہے کہ جس پلڑے میں رکھا جائے اس پلڑے کو جھکا دے۔

اہلِ جنّت

جنت خدا کی انتہائی بامعنی تخلیق ہے۔ جنت ان قیمتی انسانوں کو دی جائے گی جو دنیا میں خدا کے سچے بندے بن کر رہے ہوں۔ جو لوگ دار الامتحان میں اعلیٰ زندگی گزاریں وہی دار الجزاء میں اعلیٰ قیام گاہ کے مستحق ٹھہریں گے۔

جنت اس نادر انسان کے لیے ہے جو غیب کی سطح پر حقیقت کا ادراک کرے۔ جو مفادات اور اعزازات سے بلند ہو کر زندگی گزارے۔ جو نہ دکھائی دینے والی چیزوں کو دیکھے۔ جو کھونے میں پانے کا راز دریافت کرے۔ جو ظاہر سے گزر کر باطن کو دیکھ سکے۔ جو انا رکھتے ہوئے اپنے آپ کو بے انا بنا لے۔

لوگ تعریف میں خوش ہوتے ہیں، جنت والا آدمی تنقید کا استقبال کرتا ہے۔ لوگوں کو اونچے مقام پر بیٹھنے میں لذت ملتی ہے، جنت والا آدمی اپنے آپ کو نیچے بٹھا کر سکون محسوس کرتا ہے۔ لوگ چیزوں کو مفاد کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، جنت والا آدمی ہر چیز کو اصول کی نظر سے دیکھتا ہے۔ لوگ اپنے کو نمایاں کرنے کے شائق ہوتے ہیں، جنت والا یہ چاہتا ہے کہ اپنے کو گمنامی کے گوشے میں چھپا لے۔

لوگ دوسروں کا احتساب کرنے کے لیے دوڑتے ہیں، جنت والا انسان اپنے احتساب کے لیے فکرمند رہتا ہے۔ لوگ دوسروں کی غلطی بتانے میں مہارت دکھاتے ہیں، جنت والا انسان اپنی غلطیوں کی تلاش میں گم رہتا ہے۔ لوگ ظاہری رونقوں میں جیتے ہیں، جنت والا انسان اندرونی حقائق کے سمندر میں غوطہ زن ہوتا ہے۔

لوگوں کی دلچسپی اس میں ہوتی ہے کہ وہ بولیں، جنت والا انسان چاہتا ہے کہ وہ ہمیشہ چپ رہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ دنیا ان کے کارناموں سے واقف ہو، جنت والا انسان چاہتا ہے کہ اس کا ہر کام دنیا کی نظر سے چھپا رہے، لوگ "شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم" کے احساس میں جیتے ہیں، جنت والا انسان اس احساس سے تڑپ اٹھتا ہے کہ میں تو کوئی ایسا کام نہ کر سکا جس کو میں رب العالمین کے سامنے پیش کر سکوں۔

اہلِ جنت کا کردار جنتی کردار ہوتا ہے، اہلِ جہنم کا کردار جہنمی کردار۔

صرف ایک بار

موجودہ دنیا میں لذتِ طلب ہے، مگر یہاں لذتِ حصول نہیں۔ یہاں منزل کی طرف دوڑنا ہے، مگر یہاں کسی کے لیے اپنی مطلوب منزل پر پہونچنا مقدر نہیں۔

ایک شخص زندگی کی جدوجہد میں داخل ہوتا ہے۔ وہ کامیاب زندگی حاصل کرنے کے لیے اپنا سارا وقت اور اپنی ساری طاقت لگا دیتا ہے۔ مگر کامیاب زندگی پالینے کے باوجود اس کا احساسِ محرومی ختم نہیں ہوتا۔

اپنے نشانہ کے مطابق، جب آدمی قابل اعتماد جاب، اچھی کار، فرنشڈ مکان، حاصل کرلیتا ہے تو اس کے بعد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی آرزوؤں کی تکمیل نہ کرسکا۔ اب زندگی اس کے لیے "عیش" نہیں رہتی، بلکہ زندگی اس کے لیے صرف "ذمہ داری" بن کر رہ جاتی ہے۔

آدمی سمجھتا ہے کہ وہ پانے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف کھونے کی طرف تیزی کے ساتھ اپنا سفر طے کر رہا ہے۔ آدمی اس گمان میں مبتلا ہے کہ وہ اپنے مطلوب کو حاصل کر رہا ہے، حالانکہ اس کے برعکس اصل واقعہ یہ ہے کہ وہ ہر لمحہ اپنے مطلوب سے دور ہوتا جارہا ہے۔ وہ اپنا سفر برعکس سمت میں جاری کیے ہوئے ہے۔ اور جو شخص جتنا زیادہ تیز رفتار ہے اتنا ہی زیادہ تیزی کے ساتھ وہ اپنی منزل سے دور ہوتا جارہا ہے۔

آدمی کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ اس نے دنیا کو اپنا نشانہ بنایا۔ آدمی کے لیے صحیح بات یہ تھی کہ وہ آخرت کو اپنا نشانہ بنائے۔ آدمی کو جاننا چاہیے کہ دنیا صرف بیج بونے کی جگہ ہے، وہ فصل کاٹنے کا مقام نہیں۔ جو آدمی دنیا کو چاہے، اس نے ایسی چیز کو چاہا جو سرے سے ملنے والی نہیں۔ عقل مند وہ ہے جو آخرت کا طالب بنے۔ کیوں کہ آخرت ہی حقیقی ہے، اور وہی وہ چیز ہے جس کو کوئی پانے والا موت کے بعد کی زندگی میں اپنے لیے پائے گا۔

زندگی کا سب سے زیادہ سنگین پہلو یہ ہے کہ یہ زندگی کسی کو صرف ایک بار ملتی ہے۔ آدمی کو صرف ایک بار عمل کرنے کا موقع دیا گیا ہے۔ اس کے بعد صرف ابدی انجام ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ آدمی موجودہ دنیا میں اپنی زندگی کے استعمال کے معاملہ میں انتہائی حد تک سنجیدہ اور محتاط ہو، وہ اپنی زندگی کا رخ متعین کرنے میں آخری حد تک باہوش انسان بن جائے۔

رضوان اللہ، رضوان العباد

قرآن وحدیث میں بار بار مختلف انداز سے یہ بات کہی گئی ہے کہ آخرت کے اعتبار سے صرف اس عمل کی قیمت ہے جس میں ابتغاء رضوان اللہ (الحدید ۲۷) کی روح پائی جاتی ہو۔ جو عمل اس روح سے خالی ہو وہ آخرت کی میزان میں کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں۔

اللہ تعالیٰ کسی انسان کے صرف ظاہری عمل کو دیکھ کر اس کے بارہ میں فیصلہ نہیں کرتا۔ وہ اس کی قلبی حالت کے اعتبار سے اس کا فیصلہ کرتا ہے جس کو شریعت میں نیت کہا گیا ہے۔ اس پہلو سے تمام انسانی اعمال کی صرف دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو رضوان اللہ (اللہ کی خوشی) حاصل کرنے کے لیے کیا جائے۔ دوسرا وہ جو رضوان العباد (بندوں کی خوشی) حاصل کرنے کے لیے کیا گیا ہو۔

جو شخص رضوان اللہ کا طالب ہو، اس کا رخ ہمیشہ اللہ کی طرف ہوتا ہے، وہ ہر معاملہ میں اللہ کی پسند اور ناپسند کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنا رویہ ہمیشہ اصولِ حق کی بنیاد پر متعین کرتا ہے۔ وہ وہی بات بولتا ہے جو اللہ کی مرضی کے مطابق ہو اور اسی سمت میں چلتا ہے جدھر اللہ نے چلنے کا حکم دیا ہے۔ وہ اپنی اس روش پر قائم رہتا ہے، خواہ تمام انسان اس کے مخالف ہو جائیں۔ خواہ اس کے نتیجہ میں وہ خود اپنے لوگوں سے کٹ جائے۔

اس کے برعکس معاملہ اس شخص کا ہوتا ہے جو رضوان العباد کا طالب بنا ہوا ہو۔ اس کی توجہ کا مرکز اللہ کے بجائے انسان بن جاتے ہیں۔ وہ ہر معاملہ میں اپنی قوم، اپنے حلقہ، اپنی پارٹی اور اپنے دنیوی سرپرستوں کی طرف دیکھتا ہے، وہ ایسے الفاظ بولتا ہے جو ان انسانوں کو پسند ہوں، وہ ایسے عمل کرتا ہے جو ان انسانوں کے درمیان اس کو مقبول بنانے والے ہوں۔

جو شخص رضوان اللہ کا طالب ہو، وہ اللہ کے معاملہ میں آخری حد تک حساس ہوتا ہے۔ وہ ہر دوسرے پہلو کو نظر انداز کر سکتا ہے مگر اللہ والے پہلو کو نظر انداز کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس جو لوگ رضوان العباد کے طالب ہوں، وہ انسانوں کے بارہ میں سب سے زیادہ حساس بن جاتے ہیں وہ انسانوں کا اس طرح لحاظ کرنے لگتے ہیں جس طرح خدا کا لحاظ کرنا چاہیے۔

اوّل الذکر لوگوں کا مقام جنت ہے اور ثانی الذکر لوگوں کا مقام جہنم۔

ایک تاثر

جنّت خدا کے محبوب بندوں کی دنیا ہے اور جہنم خدا کے مبغوض بندوں کی دنیا۔ جنت خدا کے انعام یافتہ لوگوں کی بستی ہے اور جہنم خدا کے سزا یافتہ لوگوں کی بستی۔

جنت ان لوگوں کے لیے ہے جو سچائی کا اعتراف کریں، جہنم ان لوگوں کے لیے ہے جو سچائی کی آواز سنیں اور اس کو نظر انداز کر دیں۔ مگر آج وہ روح کہیں نظر نہیں آتی جس کو اعتراف میں لذت ملے: ہر آدمی بے اعترافی کی شاخ پر اپنا آشیانہ بنائے ہوئے ہے۔

جنّت ان لوگوں کے لیے ہے جو ہر قسم کی ظاہری عظمتوں سے اپنے آپ کو اوپر اٹھائیں۔ اور خالص عظمتِ خداوندی میں جینے والے بن جائیں۔ اس کے برعکس جہنم ان لوگوں کے لیے ہے جو غیر خدائی عظمتوں میں جئیں۔ مگر آج کا انسان غیر خدائی عظمتوں میں گم ہے۔ خدائی عظمت میں جینے والا انسان ڈھونڈنے پر بھی کہیں نظر نہیں آتا۔

جنّت ان لوگوں کے لیے ہے جو آخرت کے لیے متحرک ہوں، اور جہنم ان لوگوں کے لیے جو دنیا کی خاطر حرکت میں آئیں۔ مگر آج لوگوں کا یہ حال ہے کہ صرف دنیا کا مفاد انھیں متحرک کرتا ہے آخرت کا مفاد انھیں متحرک کرنے والا نہیں بنتا۔

جنّت ان لوگوں کے لیے ہے جن کا یہ حال ہو کہ خدا و رسول کے حکم کا ایک حوالہ انھیں جھکنے پر مجبور کر دے۔ اور جہنم ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا و رسول کے حکم پر جھکنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ مگر آج یہ حال ہے کہ انسان کے نزدیک خدا اور رسول کے حکم کوئی اہمیت نہیں۔ اس کے لیے جو چیز سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ اس کی شخصی یا قومی خواہشیں ہیں۔

جنّت ان لوگوں کے لیے ہے جو ربانی اخلاقیات میں جئیں۔ جنھیں سچ بولنے میں لذت ملے، جن کی روح حق کی ادائیگی میں تسکین پائے۔ اس کے برعکس جہنم ان لوگوں کے لیے ہے جو جھوٹ میں لذت پائیں، جو ناانصافی کو اپنی غذا بنائے ہوئے ہوں۔

جہنّم کے دروازہ پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے، اور جنّت کی طرف جانے والا راستہ بالکل سونا پڑا ہوا ہے۔ کیسا عجیب ہے یہ غیر خدائی منظر جو آج خدا کی دنیا میں ہر طرف نظر آتا ہے۔

فہرستِ آرزو

کلیری سمپسن (Cleary Simpson) امریکہ کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ مختلف قسم کے وقتی جاب کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ ان کی تمناؤں کے مطابق، ان کو امریکہ کے ٹائم میگزین میں اپنی پسند کا کام مل گیا۔ اس وقت وہ ٹائم کے نیویارک کے دفتر میں ڈائرکٹر (Advertising Sales Director) ہیں۔

ٹائم کے شمارہ ۵ اگست ۱۹۹۱ (صفحہ ۴) میں مذکورہ خاتون کا ہنستا ہوا پُر ابتہاج فوٹو چھپا ہے۔ وہ اس عہدہ کے ملنے پر انتہائی خوش ہیں۔ تصویر کے نیچے ان کا پُر مسرت تاثر ان لفظوں میں درج ہے ——— ٹائم کے لیے کام کرنا ہمیشہ سے میری فہرست آرزو پر تھا :

Working for *Time* was always on my wish list.

ہر آدمی کسی چیز کو سب سے بڑی چیز سمجھتا ہے۔ وہ اس کی تمنا میں جیتا ہے۔ وہ اس کا خواب دیکھتا ہے۔ اس کے صبح و شام اس کی یادوں میں گزرتے ہیں۔ وہ اس انتظار میں رہتا ہے کہ کب وہ دن آئے جب کہ وہ اپنی اس محبوب چیز کو پالے۔ یہ چیز اس کی فہرستِ آرزو میں سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ درج ہوتی ہے۔ موجودہ دنیا میں کوئی بھی ایسا آدمی نہیں جس کے لیے کوئی نہ کوئی چیز اس طرح مرکز تمنا بنی ہوئی نہ ہو۔

مومن وہ ہے جس نے جنت کو اپنی فہرستِ آرزو (وش لسٹ) میں لکھ رکھا ہو۔ ابدی اور معیاری نعمتوں کی وہ دنیا جہاں وہ اپنے رب کو دیکھے گا۔ جہاں سچے انسانوں سے اس کی ملاقات ہوگی۔ جہاں وہ خدا کی رحمتوں کے سایہ میں زندگی گزارے گا۔ وہ دنیا جو لغو اور تاثیم سے پاک ہوگی۔ جہاں صخب اور نصب کو ختم کر دیا جائے گا۔ جس کا ماحول چاروں طرف حمد اور سلامتی سے بھرا ہوا ہوگا۔ جہاں خوف اور حزن کو حذف کیا جا چکا ہوگا۔ جہاں ایسی آزادی ہوگی جس پر کوئی قید نہیں۔ جہاں ایسی لذتیں ہوں گی جن کے ساتھ محرومیت شامل نہیں۔

جب کسی شخص پر زندگی کی حقیقت کھلتی ہے تو وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ اس کے لیے سب سے بڑی چیز جنت ہے۔ وہ جنت کا حریص بن جاتا ہے۔ اور جنت اسی کے لیے ہے جو حرص کے درجہ میں جنت کا طلبگار بن گیا ہو۔

منصوبۂ تخلیق

قرآن گویا خدا کے تخلیقی منصوبہ کا اعلان ہے۔ قرآن کے ذریعہ خالق نے تمام انسانوں کو بتایا ہے کہ وہ کس خاص منصوبہ کے تحت زمین پر پیدا کیے گئے ہیں۔ اور فکر و عمل کا وہ کون سا طریقہ ہے جس کو انھیں اپنی کامیابی کے لیے اختیار کرنا چاہیے۔ یہ منصوبہ قرآن میں مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک آیت یہ ہے: اللہ نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ وہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھا کام کرتا ہے، اور وہ عزیز و غفور ہے (الملک ۲)

قرآن کے اس بیان کے مطابق، تخلیق کا کلیدی نکتہ ابتلاء (امتحان) ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت اعلیٰ اور معیاری دنیا بنائی جس کا نام جنت ہے۔ یہ جنت ابدی راحت اور ابدی سرفرازی کی جگہ ہے۔ موجودہ دنیا کی زندگی اس جنت میں داخلہ کا ایک امتحانی مرحلہ ہے۔ جو آدمی یہاں کا مقرر امتحان پاس کر لے اس کے لیے موت کے بعد ابدی جنتوں کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔

یہ امتحان کس بات کا ہے۔ وہ یہ ہے کہ غیب میں رہتے ہوئے آدمی اپنے خدا کو پہچانے اور اپنے دل و دماغ میں اس کو سب سے اونچی جگہ دے۔ وہ اپنے قول و عمل پر خود اپنے فیصلے سے خدا کی لگام لگائے۔ بظاہر بااختیار رہتے ہوئے وہ اپنے آپ کو خدا کے مقابلہ میں بے اختیار بنا لے۔ وہ خدا کی اس تقسیم پر راضی ہو جائے کہ موجودہ دنیا اس کے لیے ذمہ داریاں ادا کرنے کی جگہ ہے، اور آخرت کی دنیا حقوق اور انعام حاصل کرنے کی جگہ۔

جنت میں داخلہ کا ٹکٹ اس انسان کو دیا جائے گا جو جنت کو دیکھے بغیر جنت کی معرفت حاصل کر لے۔ وہ آخرت کی نعمتوں کی خاطر دنیا کی نعمتوں سے بے رغبت ہو جائے۔ وہ آزادی رکھتے ہوئے اپنے آپ کو پابند بنا لے۔ وہ اپنی نفسانی خواہشوں کو دبائے اور اپنی ضمیر کی آواز کو اپنا رہنما بنائے۔ وہ بے اصولی کی زندگی کو چھوڑ کر ایک بااصول انسان جیسی زندگی اختیار کرے۔

جو لوگ اس امتحان میں پورے اتریں ان کے لیے خدا کے ابدی انعامات ہیں۔ اور جو لوگ اس میں پورے نہ اتریں ان کے لیے خدا کے یہاں نہ رحمت ہے اور نہ انعام۔

مستقبل پکار رہا ہے

درخت کیا ہے۔ درخت خدا کا ایک جادو ہے ۔ وہ ایک معجزاتی واقعہ ہے جو خدا اپنی خصوصی قدرت سے زمین پر ظاہر کرتا ہے۔ درخت اس بات کا اعلان ہے کہ کوئی ہے جو اپنا بیج زمین میں ڈالے تاکہ خدا اس کے لئے زندگی اور ہریالی کا ایک نیا امکان کھول دے، کوئی ہے جو خدا کے ساتھ ایک امید قائم کرے تاکہ خدا اس کی امید کو اس کے قیاس و گمان سے بھی زیادہ بڑی مقدار میں اس کے حق میں پورا کر دے۔

جب برسات کا موسم آتا ہے اور پانی سے لدے ہوئے بادل آسمان میں تیرنا شروع کرتے ہیں۔ بجلی کی کڑک چمک فضاؤں میں ایک تبدیلی کا اعلان کرتی ہے۔ ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے بارش کا پیغام لے کر ہر طرف دوڑنے لگتے ہیں تو یہ سب دراصل خدا کے ایک مطلوب کا اظہار ہوتا ہے، یہ مطلوب کہ خدا اپنی زمین میں کچھ ہرے بھرے درخت اگانا چاہتا ہے۔ اس وقت جو کسان خدا کے اعلان کو سمجھ لے اور ایک بیج لے کر زمین میں ڈال دے تو اس کے فوراً بعد خدا کا جادو ظاہر ہوتا ہے۔ جہاں خالی زمین تھی وہاں معجزاتی طور پر ایک سرسبز و شاداب کائنات نکل کر کھڑی ہو جاتی ہے جس کے سائے کے نیچے لوگ پناہ لیں۔ جس کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں ۔ جو لوگوں کے لئے رنگت اور خوشبو اور لذت کا ایک عظیم خدائی دسترخوان بن جائے۔

دنیا کا معاملہ بھی آج کچھ ایسا ہی ہے۔ موجودہ دنیا کو دیکھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک حد پر پہونچ کر کسی نئے انقلاب کا انتظار کر رہی ہے ـــ خدا کا نام آج لوگوں کے لیے ذاتی کاروبار کا

عنوان بن چکا ہے۔ خدا کی دی ہوئی آزادی کو صرف فساد اور بگاڑ کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ خدا کی پیدا کی ہوئی نعمتیں لوگوں کے لئے لوٹ کا میدان بنی ہوئی ہیں۔ خدا کی دنیا میں انسان نے خود اپنے آپ کو خدائی کے مقام پر بٹھا رکھا ہے۔ ظلم اور فساد اتنا بڑھ چکا ہے کہ انسانی نسل پر دوبارہ وہ الفاظ صادق آتے ہیں جو حضرت نوح نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے بارہ میں کہے تھے: انک ان تذرھم یضلوا عبادک ولا یلدوا الا فاجرا کفارا (نوح ۲۷)

بگاڑ کی یہ انتہا اس بات کی علامت ہے کہ خدا کا فیصلہ ظاہر ہو۔ وہ وقت آگیا ہے کہ دوبارہ زمین پر ایک طوفان نوح برپا ہو، تاکہ تمام برے لوگ اس میں غرق کر دئے جائیں اور تمام اچھے لوگ اس سے بچا کر خدا کی زمین کے وارث بنا دیے جائیں اور پھر وہ ایک ایسی دنیا کی تعمیر کریں جو موجودہ دنیا سے زیادہ بہتر ہوگی اور زیادہ بابرکت۔

مگر طوفان نوح سے پہلے اعلان نوح کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ خدا کے بندوں میں سے کچھ بندے اٹھیں اور اپنی صحیح ترین اور کامل ترین صورت میں حق کا اعلان کر دیں۔ خدائی موسم اب آخری طور پر آچکا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ کوئی کسان اپنا بیج لے کر زمین میں ڈال دے۔ جس دن یہ واقعہ ہوگا اسی دن خدا کا معجزاتی کرشمہ بھی ظاہر ہو جائے گا۔ خدائی نصرتیں اس بندہ کے اوپر آسمان کے دروازے پھاڑ کر ٹوٹ پڑیں گی تاکہ جو کچھ بندے کو کرنا ہے بندہ اسے انجام دیدے۔ اور تاکہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے خدا اس کو ظہور میں لے آئے۔

اعلان حق کا مطلب حق کو آخری حد تک مبرہن کر دینا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کل خدائی کی سطح پر کھولا جانے والا ہے اس کو آج بندگی کی سطح پر لوگوں کے لئے کھول دیا جائے۔ اس کے بعد وہ لوگ ایک طرف ہو جاتے ہیں جنہوں نے حق کو پہچان کر اس کا ساتھ دیا تھا۔ اور وہ لوگ دوسری طرف ہو جاتے ہیں جنہوں نے حق کو نہیں پہچانا اور اپنے آپ کو اس کی سمت میں کھڑا نہیں کیا۔ جب یہ عمل پورا ہوتا ہے تو اس کے فوراً بعد خدا کا آخری فیصلہ آجاتا ہے۔ اس وقت لوگ دیکھ لیتے ہیں کہ پہلا گروہ جنت کے زینہ پر کھڑا ہوا تھا اور دوسرا گروہ جہنم کے زینہ پر۔

توبہ کا کرشمہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ـــــــ مگر جو شخص توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک کام کرے تو اللہ ایسے لوگوں کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے (الفرقان ۷۰) سیئات کا حسنات بن جانا کوئی پُراسرار واقعہ نہیں، یہ ایک معلوم نفسیاتی حقیقت ہے۔ اصل یہ ہے کہ ایک شخص جس کے اندر انسانی جوہر موجود ہو، اس سے جب برائی کا کوئی فعل ہو جاتا ہے تو اس کے بعد اس کا ضمیر نہایت شدت کے ساتھ جاگ اٹھتا ہے۔ اس کی روح آخری حد تک تڑپ اٹھتی ہے۔ اس طرح اس کی برائی اس کے لیے بھلائی کا محرک بن جاتی ہے۔ ماضی کی غلطی کو نہ دہرانے کا احساس اس کے مستقبل کو شاندار طور پر درست کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس نفسیاتی معاملہ کی ایک نہایت واضح مثال حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی زندگی میں پائی جاتی ہے۔

۹۳ھ میں عمر بن عبد العزیز اموی حکومت کی طرف سے مدینہ کے گورنر تھے۔ ان کو دمشق سے خلیفہ الولید کی یہ تحریری ہدایت ملی کہ خُبیب بن عبد اللہ بن الزبیر کو پچاس کوڑے مارو اور سخت جاڑے کے موسم میں ان کے سر پر ٹھنڈا پانی بہاؤ اور ان کو مسجد کے دروازہ پر کھڑا کر دو۔ عمر بن عبد العزیز نے اس حکم پر عمل کیا۔ اسی دن خُبیب کا انتقال ہو گیا۔ خبیب کی موت کے بعد عمر بن عبد العزیز کو خوف خدا کا شدید احساس ہوا۔ اس کے بعد وہ اپنے کو غیر مامون سمجھنے لگے۔ ان کا حال یہ ہو گیا کہ اگر ان کو ان کے کسی کار خیر پر آخرت کے انعام کی بشارت دی جاتی تو وہ کہہ اٹھتے کہ کیوں کر ایسا ہو سکتا ہے جب کہ خبیب میرے راستہ میں ہیں۔ ایک اور روایت کے مطابق وہ کہتے کہ ایسا تو جب ہو گا جب کہ خبیب میرے راستہ میں حائل نہ ہوں۔ پھر وہ اس عورت کی طرح چیخ پڑتے جس کا بچہ گم ہو گیا ہو۔ جب ان کی تعریف کی جاتی تو وہ کہتے کہ اگر میں خبیب سے بچ گیا تو میں بھلائی پر ہوں۔ اس واقعہ کے بعد وہ آخر عمر تک غم اور خوف میں مبتلا رہے۔ انھوں نے عبادت اور گریہ و زاری کی انتہا کر دی۔ (البدایہ والنہایہ ۹/۸۷)

اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد ابن کثیر لکھتے ہیں کہ یہ ان کی طرف سے ایک لغزش تھی۔ مگر اس کے سبب سے ان کو بہت بھلائی ملی۔ یعنی عبادت اور گریہ و زاری اور غم اور خوف اور احسان اور عدل اور صدقہ اور نیکی اور غلاموں کو آزاد کرنا، وغیرہ۔

جنت کا ٹکٹ

مغربی دنیا کے ایک سفر میں میری ملاقات ایک مسلمان سے ہوئی۔ ان کی عمر پچاس سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ انھوں نے کہا: مجھ کو تو جنت کا ٹکٹ چاہیے، مجھ کو آپ صرف یہ بتائیے کہ جنت کا ٹکٹ کیا ہے۔

میں نے کہا کہ جنت کا کوئی ٹکٹ نہیں۔ یہ جنتی ٹکٹ کا معاملہ نہیں، یہ جنتی شخصیت کا معاملہ ہے۔ آخرت کی قیمتی جنت اس آدمی کو ملے گی جس نے اپنے اندر جنتی شخصیت کی تعمیر کی تھی۔ جنت میں داخلہ کسی کو "ٹکٹ" کے ذریعہ نہیں ملے گا۔ جنت کی قیمت آدمی کا اپنا وجود ہے، اپنے وجود کی قیمت دے کر ہی کوئی شخص جنت کی دنیا میں اپنے لیے داخلہ پا سکتا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جنت تزکیہ کرنے والوں کے لیے ہے (ذالک جزاء من تزکیٰ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ کی شرط یہ ہے کہ آدمی مزکّیٰ شخصیت لے کر وہاں پہنچا ہو۔ یعنی وہ ایک ایسا انسان ہو جس کے اندر پاک روح بسی ہوئی ہو، جس کا دل اور دماغ آلائشوں سے پاک ہو۔ جس نے اپنے اندر ربانی شخصیت کا باغ اگایا ہو۔

موجودہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جس کے ایک طرف کیچڑ ہے اور دوسری طرف صاف وشفاف پانی۔ آدمی چاہے تو اپنے کو کیچڑ میں گندا کرے، اور چاہے تو صاف پانی میں نہا کر صاف ستھرا بن جائے۔ جو لوگ اپنے آپ کو گندا کریں، وہ آخرت میں جہنم میں ڈال دیے جائیں گے۔ اور جو لوگ اپنے آپ کو پاک کریں، ان کو جنت کی نعمت گاہوں میں بسایا جائے گا۔

اعتراف کے موقع پر اعتراف کرنا اپنی شخصیت کو پاک کرنا ہے اور اعتراف کے موقع پر بے اعترافی کا رویہ اختیار کرنا اپنی شخصیت کو گندا کرنا۔ اسی طرح ایک موقع آتا ہے جس میں ایک شخص اعلیٰ اخلاق کا ثبوت دیتا ہے اور دوسرا شخص پست اخلاق کا۔ ایک موقع آتا ہے جس میں ایک شخص حق تلفی کرتا ہے اور دوسرا شخص حق رسانی۔ ایک موقع آتا ہے جس میں ایک شخص امین ثابت ہوتا ہے اور دوسرا شخص خائن۔ ایک موقع آتا ہے جس میں ایک شخص تواضع کے راستہ پر چلتا ہے اور دوسرا شخص سرکشی کے راستہ پر۔

ان میں سے اول الذکر آدمی اپنی شخصیت کو پاک کرنے والا ہے، وہ جنت کی نفیس دنیا میں داخلہ پائے گا۔ ثانی الذکر آدمی اپنی شخصیت کو گندا کرنے والا ہے، اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

صحیح رخ

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : مارأیت مثل النار نام هاربها ومارأیت مثل الجنة نام طالبها۔ حدیث میں ہارب نار (جہنم سے بھاگنے والا) اور طالب جنت (جنت کا چاہنے والا) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ اسلوب بہت بامعنی ہے۔ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ آدمی کی تخلیق اس ڈھنگ پر کی گئی ہے کہ وہ عین اپنی فطرت کے اعتبار سے ہارب جہنم اور طالب جنت بنے۔ اگرچہ اپنی فطرت سے انحراف کرکے وہ اس سے مختلف انسان بن جاتا ہے۔

انسان تکلیف کو برداشت نہیں کرپاتا۔ کسی بھی قسم کا دکھ انسان کے لیے آخری حد تک ناپسندیدہ چیز ہے۔ اس کے بجائے انسان کا حال یہ ہے کہ وہ راحت کو دل وجان سے چاہتا ہے، وہ خوشی اور لذت کا انتہائی حد تک دلدادہ ہے۔ چنانچہ اس کی پوری زندگی انھیں دو چیزوں کے گرد گھومتی ہے۔ یعنی مصیبت سے اپنے آپ کو بچانا اور دنیا کی راحت کو اپنے لیے جمع کرنا۔

مگر یہ حقیقت پسندی کے خلاف ہے۔ ساری تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی انسان کے لیے نہ تو یہ ممکن ہے کہ وہ تکلیف اور مصیبت سے اپنے آپ کو مکمل طور پر بچالے۔ اور نہ کسی کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ راحت اور خوشی کو حقیقی معنوں میں اپنے لیے حاصل کرلے۔ آدمی ساری زندگی اسی کی دوڑ دھوپ میں لگا رہتا ہے۔ مگر آخر کار اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ مصیبتوں سے محفوظ زندگی حاصل کرتا ہے اور نہ آرام وراحت کی دنیا اپنے لیے بنا پاتا ہے۔

ایک طرف انسان کا یہ جذبہ ہے اور دوسری طرف موجودہ دنیا میں اس کا ناقابل حصول ہونا، ان دونوں باتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس جذبہ کا اصل رخ آخرت کی طرف تھا۔ مگر انسان نے انحراف کرکے اس کو دنیا کی طرف موڑ دیا۔

انسان کی فطرت ہر لمحہ پکار رہی ہے کہ اے شخص تو ہارب جہنم اور طالب جنت بن۔ کامیاب وہ ہے جو اس آواز کو سن کر اس کی پیروی کرے۔ ناکام وہ ہے جو اس آواز کو نہ سنے اور آخر کار ابدی مایوسی کے گڑھے میں جا گرے۔

لاعیش اِلّاعیش الآخرۃ

قرآن میں مختلف انداز سے جنّت کی راحتوں سے بھری ہوئی زندگی کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ایک مقام پر جنت کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے : نعم الثواب وحسنت مُرتفقا (وہ کیسا اچھا انعام ہے اور کیسی اچھی رہنے کی جگہ) الکہف ۳۱

ہر آدمی خوشی اور آرام کی زندگی چاہتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ دنیا میں ہر طرف خوشی اور آرام کے سامان پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی پوری طاقت ان چیزوں کو حاصل کرنے میں لگا دیتا ہے۔ مگر جب وہ ان چیزوں کو حاصل کر لیتا ہے تو اس پر ایک نئی حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ اب وہ جانتا ہے کہ راحت کے ہر قسم کے سامان کے باوجود وہ راحت کی زندگی سے محروم ہے۔ اس دنیا میں آدمی کو سامانِ راحت کو تلاش کرنے کی خوشی تو ملتی ہے مگر سامانِ راحت سے متمتع ہونے کی خوشی کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں راحت کا صرف تعارف ہے، راحت سے تمتع (enjoyment) موجودہ دنیا میں کسی کے لیے ممکن نہیں۔ راحت سے متمتع ہونے کے لیے ایک کامل دنیا درکار ہے۔ موجودہ دنیا ایک ناقص دنیا ہے، اس لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص یہاں راحت سے متمتع ہو سکے۔

آدمی کے اس مطلوب کو پانے کا مقام صرف آخرت ہے۔ آخرت ایک کامل دنیا ہوگی۔ وہاں راحت کے تمام سامان اپنی آخری معیاری صورت میں فراہم کیے جائیں گے۔ یہ دنیا وقتی نہیں ہوگی بلکہ ابدی ہوگی۔ اسی کے ساتھ خود انسان کی وہ تمام محدودیتیں (limitations) ختم کر دی جائیں گی جو سامان راحت سے حقیقی تمتع میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ ان انتظامات کے بعد پہلی بار انسان کے لیے یہ ممکن ہو جائے گا کہ وہ اپنی پسند کی زندگی کو بھرپور طور پر پا سکے۔

آخرت کے لیے عمل کرنا اس شخص کے لیے ممکن ہوتا ہے جو حقائقِ مادی کے بجائے حقائقِ معنوی کو اہمیت دے۔ جو دکھائی دینے والی چیزوں سے گزر کر نہ دکھائی دینے والی چیزوں میں جی لگائے۔ جو آج کے فائدے کے مقابلہ میں کل کے فائدہ کو ترجیح دے۔ جو اپنی ذات میں گم ہونے کے بجائے خدا میں گم ہو جائے۔

خدا اور بندہ

علی بن ربیعہ کہتے ہیں کہ میں نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو دیکھا۔ ان کے پاس سواری کے لیے ایک جانور لایا گیا۔ جب انھوں نے اپنا پاؤں اس کے رکاب میں رکھا تو کہا بسم اللہ۔ پھر جب وہ اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیے تو کہا الحمد للہ، سبحان الذی سخر لنا ھذا وما کنا لہ مقرنین وانا الی ربنا لمنقلبون۔ اس کے بعد انھوں نے تین بار اللہ کی حمد کی اور تین بار اللہ کی تکبیر کی۔ پھر کہا: سبحانک لا الہ الا انت قد ظلمت نفسی فاغفرلی۔

راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت علی ہنس پڑے۔ میں نے پوچھا کہ اے امیر المومنین، آپ کس بات پر ہنسے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ نے سوار ہوتے ہوئے وہی کہا جو میں نے کہا۔ پھر آپ ہنس پڑے۔ میں نے پوچھا کہ اے خدا کے رسول آپ کیوں ہنسے۔ آپ نے فرمایا:

یعجب الربُّ تبارک وتعالیٰ من عبدہ اذا قال ربِّ اغفرلی۔ ویقول علم عبدی انہ لا یغفر الذنوبَ غیری۔

(تفسیر ابن کثیر ۴/ ۱۲۴)

بندہ جب کہتا ہے کہ اے میرے رب، مجھے بخش دے تو اللہ تعالیٰ اس پر تعجب کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے اس کو جانا کہ میرے سوا کوئی بھی گناہوں کو بخشنے والا نہیں۔

ربِّ اغفرلی (میرے رب، مجھے بخش دے) کہنا کوئی سادہ سی بات نہیں۔ یہ ایک عظیم ترین دریافت کے نتیجہ میں نکلنے والا کلمہ ہے جو ایک مومن کی زبان سے نکل پڑتا ہے۔

یہ کلمہ کسی کی زبان سے اس وقت نکلتا ہے جب کہ وہ غیب کے پردے کو پھاڑ کر خدا کی موجودگی کو دریافت کرے۔ یہ آزادی کے باوجود اس بات کا اقرار ہے کہ میں اپنی آزادی کو بے قید استعمال کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ یہ حشر کو دیکھے بغیر حشر کے واقعہ پر یقین لانا ہے۔ یہ اعمال کے اخروی نتائج کی حقیقت کا اس وقت اقرار کرنا ہے جب کہ ابھی وہ ظاہر نہیں ہوئے۔ یہ خدا کے ظہور سے پہلے خدا کے جلال و جبروت کے آگے جھک جانا ہے۔ یہ کلمہ معرفت کا کلمہ ہے، اور معرفت بلاشبہ اس دنیا کا سب سے بڑا عمل ہے۔

بھلانے کی ضرورت

خارش کو کھجانے سے خارش بڑھتی ہے۔ مگر جس آدمی کو خارش ہو وہ کھجائے بغیر نہیں رہتا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ تلخ تجربات کا ہے۔ تلخ تجربات کو یاد کرنا صرف نقصان میں اضافہ کرنا ہے۔ مگر اکثر لوگ تلخ تجربات کو اپنی یادوں سے نکالنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

اس دنیا میں ہر آدمی کو تلخ تجربات پیش آتے ہیں۔ زندگی ایک اعتبار سے، ناخوش گوار واقعات کا دوسرا نام ہے۔ ایسی حالت میں تلخیوں کو اور ناخوش گواریوں کو یاد رکھنا اپنے ذہن پر غیر ضروری بوجھ ڈالنا ہے۔ جو قصہ ماضی میں پیش آیا اس کو حال میں یاد رکھنا صرف اپنے دکھ کا تسلسل جاری رکھنا ہے۔ اس کو کسی طرح عقل مندی نہیں کہا جاسکتا۔

آپ کے ساتھ برا سلوک دوسرا شخص کرتا ہے، مگر اس برے سلوک کی یاد خود آپ کے اختیار کی چیز ہے۔ پھر جو کچھ آپ کے دشمن نے کیا، وہی آپ خود اپنے خلاف کیوں کریں۔

ماضی کی تلخیوں کو یاد رکھنا آدمی کے ذہن کو منتشر کرنا ہے۔ وہ آدمی کی صحت کو برباد کرتا ہے۔ وہ آدمی سے اس کا حوصلہ چھین لیتا ہے۔ وہ آدمی کو اس قابل نہیں رکھتا کہ وہ دل جمعی کے ساتھ اپنا کام کرسکے۔ پھر آدمی کیوں اپنے آپ کو اس دہرے نقصان میں مبتلا کرے۔

اس دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کی یہ لازمی شرط ہے کہ آدمی بھلانے کی عادت ڈالے۔ وہ گزرے ہوئے تلخ تجربات کو بھول جائے۔ وہ کھوئی ہوئی چیزوں کے غم میں اپنے آپ کو نہ گھلائے۔ لوگوں کی اشتعال انگیز باتوں کو سن کر وہ اپنے سکون کو برہم نہ ہونے دے۔ اس قسم کی تمام چیزوں سے غیر متاثر رہ کر اپنا کام کرنا، یہ زندگی کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ اور جو لوگ اس راز کو جانیں وہی اس دنیا میں کوئی حقیقی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

کھوئے ہوئے کی تلافی اپنے اختیار میں نہیں، مگر کھوئے ہوئے کو بھلا دینا اپنے اختیار میں ہے۔ ناخوش گوار الفاظ کو فضا سے نکالنا اپنے اختیار میں نہیں، لیکن یہ آپ کے اپنے اختیار میں ہے کہ ناخوش گوار الفاظ کو اپنے ذہن سے نکال دیں۔ پھر آپ کیوں نہ ایسا کریں کہ ناممکن سے اپنی توجہ کو ہٹالیں اور ممکن کے حصول کے لیے اپنی ساری توجہ لگا دیں۔

انسان کدھر

ہندستان کے سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی (۱۹۹۱ - ۱۹۴۴) پارلمنٹ کے دسویں الکشن (مئی ۱۹۹۱) کی مہم چلا رہے تھے۔ وہ ملک کا طوفانی دورہ کرتے ہوئے ۲۱ مئی ۱۹۹۱ کو اپنے مخصوص ہوائی جہاز کے ذریعہ تامل ناڈو پہونچے۔ وہ ہوائی اڈہ مینم پکم (Meenampakkam) پر اترے۔ یہاں وہ اپنی بلٹ پروف گاڑی میں بیٹھے اور ۳۰ سے زیادہ کاروں کے قافلہ کے ساتھ سری پرم بودور (Sriperumbudur) کے لیے روانہ ہوئے جہاں انھیں ایک الکشن میٹنگ کو خطاب کرنا تھا۔

رات کو ۱۰ بجے وہ پنڈال کے اندر عوام کی طرف سے گلدستے وصول کر رہے تھے۔ اسی دوران ایک ۲۵ سالہ عورت اپنے دونوں ہاتھ میں پھولوں کا ایک گلدستہ لیے ہوئے راجیو گاندھی کی طرف بڑھی۔ راجیو بھی احساس فتح کے ساتھ اس کی طرف بڑھے۔ کیوں کہ ہر جگہ عوامی استقبال نے انھیں یقین دلایا تھا کہ اس الکشن کے بعد وہ ملک کے وزیر اعظم بننے والے ہیں۔

عورت نے قریب آکر اپنا گلدستہ راجیو گاندھی کی طرف بڑھایا۔ مگر اس عورت کا تعلق خودکشی دستہ (suicide squad) سے تھا اور وہ اپنے جسم پر خطرناک بم باندھے ہوئے تھی۔ راجیو گاندھی نے گلدستہ اپنے ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ بم پھٹ گیا۔ راجیو گاندھی پوری طرح اس کی زد میں آگیے۔ ان کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ اسی لمحہ ان کی موت واقع ہوگئی۔

بظاہر یہ بم کا دھماکہ تھا، مگر حقیقۃً وہ موت کا دھماکہ تھا جو ہر انسان کے لیے مقدر ہے۔ اس اعتبار سے یہ صرف راجیو گاندھی کی کہانی نہیں بلکہ ہر انسان کی کہانی ہے۔ ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ کامیابی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہر آدمی کا ہاتھ خوشیوں کے گلدستہ پر ہے۔ مگر اصل حقیقت اس کی امیدوں کے بالکل برعکس ہے ——— جس چیز کو آدمی گلدستہ سمجھ کر وصول کر رہا ہے وہ اس کے لیے ہلاکت کا بم ہے۔

اس سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جن کو موت سے پہلے اپنے رب کی معرفت حاصل ہوئی جنھوں نے اپنی زندگی کو رب کائنات کی اطاعت میں گزارا۔ جن کی موت اس حال میں آئی کہ وہ اپنے پرچۂ امتحان کو کامیابی کے ساتھ حل کر چکے تھے۔

انذارِ آخرت

سر ونسٹن چرچل نے ۱۹۵۴ میں جنگ کے خلاف چیتاونی دیتے ہوئے کہا تھا کہ آج ساری دنیا جہنم کے کنارے پر گھوم رہی ہے:

The world is roaming around the brim of hell.

چرچل کے سامنے تیسری عالمی جنگ کا خطرہ تھا۔ انھوں نے اپنے انتباہ میں "جہنم" کا لفظ مجازی طور پر استعمال کیا تھا۔ مگر ایک باخبر مومن اور داعی کے لیے یہ مجاز نہیں ہے، بلکہ حقیقت ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ پوری دنیا ایک بھڑکتی ہوئی جہنم کے کنارہ کھڑی ہے۔ ہر آن یہ خطرہ ہے کہ کب وہ اس کے اندر گر پڑے تیسری عالمی جنگ کا خطرہ ٹل سکتا ہے، مگر جہنم کا خطرہ اتنا یقینی ہے کہ اس سے اللہ کے متقی بندوں کے سوا کوئی بھی مامون و محفوظ نہیں۔

تیسری عالمی جنگ کے خطرات سے جو لوگ آگاہ ہیں، وہ اس کو ٹالنے کے لیے رات دن سرگرم عمل ہیں۔ ایسی حالت میں جو لوگ جہنم کے شدید تر خطرات سے آگاہ ہیں، ان کو سیکڑوں گنا زیادہ بڑھ کر سرگرم عمل ہونا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اتنا بڑا مسئلہ ہے کہ آدمی کو اگر اس کا احساس ہو جائے تو اس کا دن کا سکون اور رات کی نیند اڑ جائے۔ اس کی نفسیات کے اندر ایک ایسا بھونچال آجائے کہ وہ چاہنے لگے کہ کاش میرا ہر بال ایک زبان ہوتا اور میں اپنی ساری قوت کو استعمال کر کے ساری دنیا کو آنے والے خطرہ سے آگاہ کر دیتا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تصویر قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ آپ لوگوں کو خدا کا مومن بنانے کے لیے اتنا زیادہ بے قرار رہتے تھے گویا کہ آپ اسی غم میں اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے۔ (الشعراء ۳)

بخاری و مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ اس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی بابت فرماتے ہیں کہ میں تم لوگوں کی کمر پکڑ کر تم کو آگ میں جانے سے روک رہا ہوں اور تم لوگوں کا حال یہ ہے کہ تم آگ میں گرے جا رہے ہو (مشکاۃ المصابیح ۱/۵۳)

جو مسئلہ جتنا زیادہ بڑا ہو اتنا ہی زیادہ ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے لیے سرگرمی دکھائی جائے۔ مومن کی نظر میں آخرت کا مسئلہ سب سے بڑا ہوتا ہے اس لیے وہ آخرت کے لیے سب سے زیادہ سرگرم ہوتا ہے۔

ہر ایک کی کہانی

ایک بس میوات کے علاقہ سے گزر رہی تھی۔ وہ اسٹینڈ پر رکی تو کچھ مسافر بس کے اندر داخل ہوئے۔ ان میں ایک بوڑھی "میونی" بھی تھی۔ اپنے سر پر گٹھری لیے ہوئے وہ ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ کہاں جاکر بیٹھے۔ ایک مسافر نے ازراہ مذاق کہا: دیکھو، وہ سیٹ خالی ہے۔ وہاں جاکر بیٹھ جاؤ۔ یہ ڈرائیور کی سیٹ تھی۔ مگر میونی کو ڈرائیور کی سیٹ اور مسافر کی سیٹ کا فرق معلوم نہ تھا۔ وہ اطمینان کے ساتھ آگے بڑھی اور "خالی سیٹ" پر جاکر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر کے بعد ڈرائیور اندر داخل ہوا۔ وہ اپنی سیٹ پر میونی کو دیکھ کر بولا: عورت، تو یہاں کیسے بیٹھ گئی۔ یہاں سے تو میں بیٹھ بس چلاؤں گا۔ میونی نے اپنی گٹھری سنبھالتے ہوئے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا: میں تو چوکھی بیٹھی ہوں، تو کہیں اور سے چلالے۔

بس کے اعتبار سے دیکھئے، تو یہ صرف ایک جاہل عورت کی کہانی معلوم ہوگی۔ مگر وسیع تر اعتبار سے دیکھئے تو موجودہ زمانہ میں یہی ہر شخص کی کہانی ہے۔ موجودہ زمانہ حرص اور حبِ دنیا کا زمانہ ہے۔ آج ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی "سیٹ" پر قناعت نہیں کرتا۔ ہر آدمی دوسرے کی "سیٹ" پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ آدمی صرف وہاں رکتا ہے جہاں حالات نے اس کو رکنے کے لیے مجبور کردیا ہو، اگر حالات اجازت دیں تو پہلی فرصت میں وہ دوسرے کی سیٹ پر قبضہ کرنے کا عمل شروع کردے گا۔

خدا کی دنیا میں ہر چیز اپنی حد کے اندر عمل کرتی ہے۔ آسمانی اجسام اپنے اپنے مدار میں گھومتے ہیں۔ جنگل کے جانور اپنے فطری دائرہ میں رہ کر زندگی گزارتے ہیں۔ خدا کی دنیا میں صرف ایک ایسی مخلوق ہے جو حد بندی کو قبول نہیں کرتی۔ یہ انسان ہے۔ انسان بار بار اپنی حد سے تجاوز کرتا ہے۔ انسان اس چیز پر قابض ہونے کا منصوبہ بناتا ہے جو باعتبار حقیقت اس کی نہیں۔

بوڑھی میونی کا کیس بیوقوفی کا کیس تھا اور دوسرے لوگوں کا کیس سرکشی کا کیس۔ بیوقوفی قابل معافی ہوتی ہے، مگر سرکشی خدا کے قانون کے مطابق قابل معافی نہیں۔

کہاں سے کہاں

مسٹر ہیم وتی نندن بہوگنا ہندستان کے ایک مشہور سیاسی لیڈر تھے۔ وہ امریکہ میں کلیولینڈ (Cleveland) کے اسپتال میں زیر علاج تھے۔ ۱۷ مارچ ۱۹۸۹ کو اسپتال ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ بوقت انتقال ان کی عمر ۷۰ سال تھی۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۸ مارچ ۱۹۸۹، صفحہ ۱۳) میں ان کے حالات درج کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ مسٹر بہوگنا نے اپنی زندگی میں غیر معمولی سیاسی شہرت حاصل کی، اور آخر میں تقریباً تنہائی کی حالت میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے تمام دوست ایک کے بعد ایک انھیں چھوڑتے چلے گیے۔ ان کے سیاسی شریک کار ان سے جدا ہوگیے۔ اور، ۴۵ سالہ سیاسی زندگی کے آخر میں، انھوں نے اپنے آپ کو تنہائی کے بیابان میں پایا:

> One by one, his friends left him, his political allies deserted him and, at the end of a political career spanning 45 years, he found himself in near wilderness. (p. 13)

تبصرہ نگار نے یہاں مسٹر بہوگنا کا جو انجام بتایا ہے، وہی انجام وسیع تر پیمانہ پر ہر شخص کا ہونے والا ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی شاندار "۴۵ سالہ" زندگی گزار رہا ہے، صرف اس لیے تاکہ اچانک اس کی شاندار زندگی کا خاتمہ ہو جائے اور وہ موت کے دروازہ سے گزار کر خدا کی عدالت میں پہونچا دیا جائے۔

اس دنیا میں ہر آدمی کو "۴۵ سال" ملتے ہیں۔ یہ مدت اس لیے نہیں ہے کہ وہ اپنا شاندار سیاسی کیریر بنائے۔ وہ صرف اس لیے ہے کہ آدمی آنے والے مستقبل کی ابتدائی تیاری کرے۔ جو لوگ اپنے "۴۵ سال" کو تیاری کا ابتدائی وقفہ سمجھیں اور اس کے لیے اسے استعمال کریں وہ آنے والے مستقل مرحلہ میں کامیاب رہیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنے "۴۵ سال" ہی کو سب کچھ سمجھ لیں، ان کا حال اس انسان کا سا ہوگا جو بیج ڈالنے سے پہلے پھل حاصل کرنا چاہے۔ ایسے شخص کے لیے آنے والی دنیا میں ابدی ناکامی کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔

کیسا عجیب ہے انسان کا شاندار حال، اور کیسا غیر شاندار ہے اس کا آخری مستقبل۔

فیض بقدرِ استعداد

حدیث میں ہے کہ تمہارے دین کی سب سے بہتر چیز تفقہ ہے (خیر دینکم الفقہ) رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس کے لیے ان الفاظ میں دعا فرمائی: اللّٰھم فقّھہ فی الدّین وعَلِّمہ التاویل (خدایا، اس کو دین کی فہم عطا فرما اور اس کو تاویل کلام کی صلاحیت دے) بخاری و مسلم میں ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے:

عن ابی موسیٰ رضی اللّٰہ عنہ عن رسول اللّٰہ صَلّی اللّٰہ عَلیہ وسلّم قال: اِنَّ مثلَ مَابعَثنِی اللّٰہُ بہ من الھدیٰ والعلم کمثل غیث اصاب ارضًا، فکانت منھا طائفۃ طیبۃ قبلت الماء فانبتت الکلأ والعشب الکثیر... وکان منھا اجادب امسکت الماء فنفع اللّٰہ بھا الناس... فشربوا منھا وسقوا وزرعوا.... واصاب طائفۃ منھا اخریٰ، انّما ھی قیعان لاتمسک ماء ولا تنبت کلأ... فذالک مثل من فقہ فی دین اللّٰہ ونفعہ مابعثنی اللّٰہ بہ فعلم وعلّم، ومثل من لم یرفع بذالک رأسا، ولم یقبل ھدی اللّٰہ الذی ارسلت بہ۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے جس ہدایت اور علم کے ساتھ مجھے بھیجا ہے اس کی مثال ایک بارش کی ہے جو زمین پر برسے۔ اس کا ایک حصّہ زرخیز تھا۔ اس نے پانی کو قبول کیا اور خوب گھاس اور سبزہ اُگایا۔ اور اس زمین کا ایک حصہ بنجر زمین ہو۔ اس نے پانی کو روکا تو اللہ نے اس سے لوگوں کو فائدہ پہونچایا۔ اور زمین کا ایک اور حصہ ڈھلوان تھا۔ وہ نہ پانی کو روکتا تھا اور نہ سبزہ اُگاتا تھا۔ پس یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے اللہ کے دین میں سمجھ حاصل کی، اس سے اس کو نفع ہوا۔ اس نے سیکھا اور سکھایا۔ اور (دوسری) مثال اس شخص کی ہے جس کو اس میں سے کوئی حصہ نہ ملا اور اس نے اس ہدایت کو قبول نہ کیا جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں۔

زمین کو بارش کا فائدہ اس کی استعداد کے بقدر ملتا ہے، یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ خدا کی ہدایت تمام انسانوں کے لیے عام ہے۔ مگر جو شخص جتنی استعداد کا ثبوت دے گا اتنا ہی فائدہ اس کو حاصل ہوگا۔ اور سب سے بڑا فائدہ جو ہدایت الٰہی سے کسی کو ملتا ہے وہ معرفت ہے۔

علم اور تقویٰ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ سے ڈرو اور وہ تم کو علم دے گا (واتقوا اللہ ویعلمکم اللہ ، البقرۃ ۲۸۲) دوسرے مقام پر کہا گیا ہے کہ اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو وہ تم کو پہچان دے گا (ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا) ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے کہ اللہ سے ڈرو... وہ تم کو روشنی عطا فرمائے گا جس میں تم چلو گے (... ویجعل لکم نوراً تمشون بہ ،

امام مالک نے امام شافعی سے ان کی جوانی کی عمر میں نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا: اے لڑکے، میں دیکھتا ہوں کہ اللہ نے تمہارے دل کو روشنی سے بھر دیا ہے تو تم اس کو گناہ کی تاریکی سے نہ بجھاؤ (یا فتی انی اری اللہ قد ملأ قلبک نوراً فلا تطفئہ بظلمۃ المعصیۃ)

امام شافعی نے اپنے استاد وکیع بن الجراح سے اپنی ایک گفتگو کا ذکر اس طرح اشعار میں کیا ہے :

شکوت الیٰ وکیع سوء حفظی فارشدنی الی ترک المعاصی

واخبرنی بان العلم نور ونور اللہ لا یہدی لعاصی

میں نے شیخ وکیع سے حافظہ کی خرابی کی شکایت کی تو انھوں نے مجھے نصیحت کی کہ گناہوں کو چھوڑ دو اور انھوں نے مجھے بتایا کہ علم روشنی ہے اور اللہ کی روشنی کسی گناہگار کو راستہ نہیں دکھاتی۔

یہاں علم سے مراد معلومات نہیں معرفت ہے۔ ایک حقیقی معرفت تک پہنچنے کے لئے صرف یہ کافی نہیں کہ آدمی کے پاس الفاظ اور معلومات کا ذخیرہ ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے اندر صحت فکر ہو۔ اللہ کا ڈر آدمی کے اندر یہی صحت فکر پیدا کرتا ہے۔

آدمی جتنا زیادہ سنجیدہ ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ اس کے اندر صحت فکر کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ اللہ کا ڈر آدمی کو سب سے زیادہ سنجیدہ بناتا ہے، اس لئے اللہ کا ڈر آدمی کو سب سے زیادہ اس قابل بناتا ہے کہ وہ صحیح اور درست طریقہ پر سوچ سکے۔

اللہ کا ڈر آدمی کے الفاظ اور معلومات کے لئے ایسا ہی ہے جیسے سانچہ خام اشیاء کے لئے۔ سانچہ خام اشیاء کو بامعنی صورت میں تبدیل کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ کا ڈر الفاظ اور معلومات کو معرفت میں ڈھال دیتا ہے۔

کچھ علوم انسانی مدرسہ میں پڑھائے جاتے ہیں اور کچھ علوم خدا کے مدرسہ میں۔

حسد کے بجائے دعا

لطیفہ ہے کہ ایک غریب دیہاتی تھا۔ وہ معاشی اعتبار سے بہت پریشان رہتا تھا۔ کسی شخص نے اس سے کہا کہ تم اکبر بادشاہ کے پاس جاؤ۔ اس کے پاس بہت پیسہ ہے اور وہ ہر مانگنے والے کو دیتا ہے۔ وہ تم کو بھی ضرور دے گا اور تمہارا معاشی مسئلہ حل ہو جائے گا۔ دیہاتی آدمی نے کہا کہ اکبر بادشاہ کو کس نے دیا ہے۔ بتانے والے نے بتایا کہ خدا نے۔ دیہاتی نے کہا کہ پھر ہم خدا ہی سے کیوں نہ مانگیں، ہم اکبر سے کیوں مانگیں۔

اس کے بعد وہ ایک روز اپنے گھر سے نکلا اور سنسان جنگل کی طرف چلا گیا۔ وہاں جاکر اس نے اپنا میلا کپڑا زمین پر بچھایا اور اس پر بیٹھ کر خدا سے دعا کرنے لگا۔ اس نے اپنی دیہاتی زبان میں کہا: اے اکبر کو دینے والے، مجھے بھی دیدے۔ وہ اسی طرح دعا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ جب وہ فارغ ہوا اور اس نے اپنا کپڑا اٹھایا تو اس کے نیچے اشرفیوں کی بھری ہوئی تھیلی موجود تھی۔ یہ لطیفہ بتاتا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے دماغ اور اونچے پڑھے لکھے لوگ اپنے شعور اور کردار کے اعتبار سے اس سطح پر بھی نہیں ہیں جہاں مذکورہ دیہاتی آدمی تھا۔

آج یہ حالت ہے کہ جب بھی کوئی شخص یہ دیکھتا ہے کہ دوسرا آدمی اس سے بڑھ گیا ہے، خواہ یہ بڑھنا مال کے اعتبار سے ہو یا حیثیت کے اعتبار سے، تو فوراً وہ حسد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے سینے میں بڑھنے والے آدمی کے خلاف نفرت اور جلن کی کبھی نہ ختم ہونے والی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ حسد اور جلن میں مبتلا ہونے والے لوگ اگر یہ سمجھیں کہ کسی کو جو کچھ ملا ہے وہ خدا کے دیئے سے ملا ہے، وہی کم کبھی دیتا ہے اور وہی زیادہ بھی دیتا ہے، تو وہ بھی وہی کریں جو مذکورہ دیہاتی نے کیا۔ وہ پانے والے انسان کے بجائے دینے والے خدا کی طرف دوڑیں۔ وہ خدا کو پکارتے ہوئے کہیں کہ جس طرح تو نے میرے بھائی کو دیا ہے اسی طرح تو مجھے بھی دیدے۔ اگر لوگوں میں یہ مزاج آجائے تو سماج کی تمام برائیاں اپنے آپ ختم ہو جائیں۔

کسی کی بڑائی کو دیکھ کر اپنی کمی کا احساس ابھرنا بذات خود ایک فطری جذبہ ہے۔ اس جذبہ کا رُخ اگر خدا کی طرف ہو تو وہ صحیح ہے اور اگر اس کا رُخ آدمی کی طرف ہو تو غلط۔

موت کے بعد

غزوہ بدر میں ابوجہل جب مہلک زخم کھا کر گرا اور مرنے کے قریب ہوا تو اس نے پوچھا کہ مجھ کو مارنے والا کون ہے۔ کسی نے بتایا کہ انصار کے ایک نوجوان نے اس کو قتل کیا ہے۔ ابوجہل یہ سن کر بولا: لوغیر اکار قتلنی (کاش کسان کے علاوہ کسی اور نے مجھ کو مارا ہوتا)

ستمبر ۱۹۸۰ کا واقعہ ہے۔ ڈنکرک (فرانس) کے ایک شخص نے خودکشی کر لی۔ اس کا نام جوزف ریڈفورڈ (Joseph Redford) تھا۔ اس وقت اس کی عمر ۶۲ سال تھی۔ اس نے مہلک زہر کی خوراک کھالی۔ اس کے بعد وہ مقامی کرکیٹ کلب میں گیا تاکہ مرنے سے پہلے اپنے کلب کے ساتھیوں سے آخری مصافحہ کر سکے۔ اس نے کلب کے ممبروں سے کہا:

Give me a whisky, I shall be dead in half an hour.

مجھ کو شراب کا ایک گلاس دو۔ آدھ گھنٹہ کے بعد میں مر جاؤں گا (ہندستان ٹائمس، نئی دہلی ۱۹ ستمبر ۱۹۸۰)

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ انسان موت کو بس "خاتمہ" کا ایک معاملہ خیال کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ کچھ دن دنیا میں رہ کر ہمیشہ کے لیے مٹ جانے کا نام موت ہے۔ اس لیے وہ چاہتا ہے کہ جب وہ مرے تو عزت اور سکون کے ساتھ مرے۔ اس کے مردہ جسم کے اوپر مقبرہ کی صورت میں ایک شاندار یادگار قائم ہو جو موجود لوگوں کو ختم ہونے والے انسان کی عظمت یاد دلاتی رہے۔

مگر یہ سخت ترین قسم کی غلط فہمی ہے۔ موت، آدمی کی زندگی کا خاتمہ نہیں، وہ آدمی کی زندگی کے ایک نئے اور طویل تر دور کا آغاز ہے۔ آدمی اگر اس حقیقت کو جانے تو "قاتل" کا حسب نسب معلوم کرنے کے بجائے وہ خود اپنے اعمال نامہ کو پڑھنے کی کوشش کرے، وہ بے خودی کی خوراک کھا کر بے خبر ہونے کے بجائے یہ چاہے کہ وہ آخری حد تک باہوش ہو جائے تاکہ کم از کم اپنے آخری لمحات کو ضائع ہونے سے بچا سکے۔

کتنا زیادہ فرق ہے بے خبر انسان اور باخبر انسان میں۔

یہ انسان

پھول کی ایک پنکھڑی یا چڑیا کا ایک چھوٹا پر کتنی حسین چیزیں ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ بے حد نازک ہیں۔ ان کو ہاتھ سے چھونے کی کوشش بھی ان کی حسین ترکیب کو بگاڑ دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا خالق بے حد لطیف ذوق والی ہستی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آدمی اس کے تخلیقی حسن کو دیکھے مگر وہ اس کو ہاتھ نہ لگائے۔ وہ اس سے اپنی روح کی غذا لے مگر اپنے جسم کی کثافت سے اس کو آلودہ نہ کرے۔

خدا کی دنیا میں ایک چیز ایسی ہے جو چڑیا کے پر اور پھول کی پنکھڑی سے بھی زیادہ نازک ہے۔ یہ انسان کا دل ہے۔ ہماری معلوم دنیا میں انسان کے دل سے زیادہ نرم و نازک کوئی چیز نہیں۔ ایسی حالت میں جو شخص کسی انسان کے دل کو دکھاتا ہے وہ خدا کی دنیا میں سب سے بڑا جرم کرتا ہے۔ کسی آرٹسٹ کے نازک ترین آرٹ کو جو شخص اپنے پیروں سے مسل دے وہ اس آرٹسٹ کی نظر میں کتنا بڑا مجرم ہوگا۔ اس سے کہیں زیادہ وہ شخص اللہ کی نظر میں مجرم ہے جو ایک نازک دل کو مسلتا ہے۔ جو ایک انسان کے سکون پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔ جو ایک انسان کے آشیانہ کو اجاڑنے کے منصوبے بناتا ہے۔

اس معاملہ میں وہ لوگ اس سے کم مجرم نہیں ہیں جو یہ سب کچھ ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں مگر وہ "گونگے شیطان" بنے رہتے ہیں۔ وہ ظالم کا ہاتھ روکنے کے لیے نہیں اٹھتے۔ وہ اپنی ممکن کوشش اس کو دفع کرنے میں نہیں لگاتے۔ پھر اس سے بھی زیادہ بڑے مجرم وہ لوگ ہیں جو ملت کو مظلومی سے نکالنے کے نام پر قیادت کرتے ہیں مگر جب ملت کا ایک مظلوم فرد ان کے سامنے آتا ہے تو اس کو مظلومی سے نکالنے کے لیے ان کے اندر کوئی تڑپ پیدا نہیں ہوتی۔ وہ تقریر میں کہتے ہیں کہ ملت کا یہ حال ہونا چاہیے کہ جب ایک ستم زدہ شخص وامعتصماہ پکارے تو ملت اس کی مدد کے لیے دوڑ پڑے اور اس وقت تک کسی کو چین نہ آئے جب تک اس شخص کو ظلم سے نجات حاصل نہ ہو جائے۔ مگر جب ایک ستم زدہ انسان وامعتصماہ کی آواز بلند کرتا ہے تو اس کی آواز پر دوڑنے کا کوئی جذبہ ان کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔

دو گروہ

جنت خدا کے نیک بندوں کی رہائش گاہ ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جنت کے دو بڑے طبقے ہوں گے۔ ایک، السابقون (سبقت کرنے والے) اور دوسرے، اصحاب الیمین (دائیں طرف والے) پہلے گروہ کے لیے آخرت میں شاہانہ انعامات ہیں، اور دوسرے گروہ کے لیے عام انعامات (الواقعہ، رکوع اول)

درجہ اول اور درجہ دوم میں، یہ فرق کس بنیاد پر ہوگا۔ قرآن کے مطابق، اس کی وجہ فتح (الحدید ۱۰) ہے۔ جو لوگ فتح سے پہلے کے دور میں حق کو مانیں اور اس کا ساتھ دیں وہ السابقون کا درجہ پائیں گے۔ اور جو لوگ فتح کے بعد کے دور میں حق کو قبول کریں اور اس کے ساتھی بنیں وہ اصحاب الیمین کے گروہ میں جگہ دیے جائیں گے۔ یہ محض زمانہ کا فرق نہیں بلکہ نوعیت کا فرق ہے۔ اور نوعیتِ ایمان کا یہی فرق دونوں گروہوں کے انجام میں فرق پیدا کر دیتا ہے۔

حق جب ظاہر ہوتا ہے تو ابتداءً وہ مجرد صورت میں ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک ایسی نظری حقیقت کی ہوتی ہے جس کی پشت پر دلائل کی طاقت کے سوا کوئی اور طاقت موجود نہ ہو۔ بعد کے زمانہ میں جب حق کی دعوت فتح وغلبہ کے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے تو اس وقت حق کی حیثیت صرف عقلی صداقت کی نہیں ہوتی بلکہ اب اس کی حیثیت مرئی واقعہ کی بن جاتی ہے۔ اب ہر آنکھ والے کو وہ ایک ٹھوس واقعہ کی صورت میں دکھائی دینے لگتا ہے۔

پہلے دور میں حق کو لفظی دلیل سے پہچاننا پڑتا تھا، دوسرے دور میں اس کی اہمیت کو منوانے کے لیے کھلے ہوئے واقعات موجود ہوتے ہیں۔ پہلے دور میں حق کو مانتے ہی آدمی اپنے ماحول کے اندر اجنبی بن جاتا تھا، دوسرے دور میں حق کے ساتھ وابستہ ہونا آدمی کو عزت اور مقبولیت کا مقام دے دیتا ہے۔ پہلے دور میں حق کا ساتھ دینے والا صرف کھوتا تھا، دوسرے دور میں حق کا ساتھ مزید پانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ پہلے دور میں بنیاد کے نیچے دفن ہونا پڑتا تھا، دوسرے دور میں گنبد کی بلندیاں مل جاتی ہیں جن کے اوپر آدمی کھڑا ہو سکے۔ یہی وہ فرق ہے جس کی بنا پر پہلے مرحلہ میں حق کا ساتھ دینے والے کے لیے درجۂ اول کا مقام ہے اور دوسرے مرحلہ میں حق کا ساتھ دینے والے کے لیے درجۂ ثانی کا مقام۔

حرص اور قناعت

پاکستان کے ڈاکٹر جاوید نے لکھا ہے کہ وہ امریکہ گئے۔ وہاں ایک کروڑپتی سے ملے۔ کروڑپتی نے ان کو اپنے ایک خاص مکان میں ملاقات کے بلایا۔ یہ مکان سمندر کے کنارے بنا ہوا تھا۔ جدید طرز کا وسیع مکان، اس کے آگے شاندار لان، اس کے آگے حدِ نظر تک پھیلی ہوئی سمندر کی لہریں۔ چاروں طرف عیش اور خوبصورتی کے مناظر۔ اس ماحول میں مہمان اور میزبان دونوں مکان کے سامنے لان میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر جاوید کہتے ہیں کہ میں اس ماحول میں گم تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں جنت کی دنیا میں بیٹھا ہوا ہوں۔ مجھ پر محویت کا عالم طاری تھا۔ امریکی کروڑپتی بھی چپ چاپ کسی سوچ میں مبتلا تھا۔ اچانک امریکی نے میری طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا: مسٹر جاوید، میں چاہتا ہوں کہ امریکہ کو چھوڑ کر پاکستان چلا جاؤں اور زندگی کے بقیہ دن وہیں گزاروں۔

"کیوں" ڈاکٹر جاوید نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"یہ سب چیزیں مجھے کاٹتی ہیں۔ مجھے ایک منٹ کے لیے بھی سکون حاصل نہیں"

یہ واقعہ دنیا کی حقیقت کو بتا رہا ہے۔ دنیا کا حال یہ ہے کہ جو شخص پانے ہوئے نہ ہو وہ سمجھتا ہے کہ پانے کا نام خوشی ہے۔ مگر جو شخص پائے وہ محسوس کرتا ہے کہ پاکر بھی اسے خوشی حاصل نہیں ہوئی۔ سب کچھ پاکر بھی اس نے خوشی کو نہیں پایا۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی نام ہے چاہی ہوئی چیز کو نہ پانے کا۔ جو لوگ اس راز کو جان لیں وہ نہ ملنے پر بھی اس طرح مطمئن رہتے ہیں جیسے کہ انھوں نے سب کچھ پا لیا ہو۔ اور جو لوگ اس راز کو نہ جانیں وہ ہمیشہ اپنی چاہی ہوئی چیز کو پانے کا خواب دیکھتے رہتے ہیں اور کبھی بھی اس کو نہیں پاتے۔ کیونکہ پانے کے بعد جلد ہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ وہ چیز نہیں جس کو انھوں نے پانا چاہا تھا۔ وہ ایک نہ ملنے والی چیز کے غم میں پڑے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اسی حال میں مر جاتے ہیں۔

مذہب کی اصطلاح میں پہلی چیز کا نام قناعت ہے اور دوسری چیز کا نام حرص۔ انھیں دو لفظوں میں زندگی کی ساری کہانی چھپی ہوئی ہے۔

عاجز انسان

جنرل مانکشا (S.H.F.J. Manekshaw) ہندستان کے پہلے فیلڈ مارشل تھے۔ اس کے بعد جنوری ۱۹۸۶ میں جنرل کیری اپا (K.M. Cariappa) کو ہندستان کے دوسرے فیلڈ مارشل کا اعزازی خطاب دیا گیا ہے۔ ۲۵ سال پہلے وہ ہندستانی فوج سے ریٹائر ہوئے تھے۔ انھوں نے ہندستانی فوج میں جو خدمات انجام دیں اس کو انگریزی اخبارات نے شاندار فوجی کردار (Illustrious military career) سے تعبیر کیا ہے اور ان کو ملک کے قومی ہیروؤں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس موقع پر دہلی میں مختلف فوجی تقریبات ہوئیں جن میں جنرل کیری اپا شریک ہوئے۔ ۱۵ جنوری ۱۹۸۶ کو نئی دہلی کے پریڈ گراونڈ میں وہ ہندستانی فوج کا معائنہ کر رہے تھے۔ فوجی جوان پرعظمت انداز میں ان کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اس دوران ۸۶ سالہ فیلڈ مارشل کیری اپا سے ایک اخبار نویس نے ان کا تاثر پوچھا۔ ان کا فوری جواب یہ تھا :

I envy them. I am not young to march with them.

مجھے ان پر رشک آتا ہے۔ میں جوان نہیں کہ ان کے ساتھ مارچ کر سکوں (ٹائمس آف انڈیا ۱۶ جنوری ۱۹۸۶)

کیسا عجیب ہے زندگی کا تجربہ۔ انسان فوجی کارنامے انجام دیتا ہے۔ وہ فتوحات کر کے اپنے آپ کو قومی ہیروؤں کی فہرست میں شامل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب کہ اس کو سب سے بڑا فوجی اعزاز دیا جائے اور اس کو فیلڈ مارشل کے پرعظمت خطاب سے نوازا جائے۔ مگر اس وقت انسان اتنا کمزور ہو چکا ہوتا ہے کہ ملنے والے انعام کو اپنے ہاتھ سے پکڑنے کی طاقت اسے حاصل نہیں ہوتی۔ وہ ان فوجیوں کے قدم بقدم چلنے سے بھی عاجز ہوتا ہے جن کو ساتھ لے کر اس نے کبھی معرکے سر کیے تھے اور قلعے فتح کیے تھے۔

انسان ایک عاجز مخلوق ہے۔ اس کا عجز اس کو حادثہ اور بڑھاپا اور موت کی صورت میں دکھایا جاتا ہے۔ مگر کوئی نہیں جو اس سے سبق لے۔ آدمی اس سب سے بڑی حقیقت کو سب سے زیادہ بھولا رہتا ہے۔ وہ صرف اس وقت جاگتا ہے جب کہ خدا کا آخری فیصلہ ظاہر ہو کر اس کو خدا کے سامنے کھڑا کر دیتا ہے۔ مگر اس وقت کا جاگنا کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں۔

سب سے بڑی بھول

ڈک شان (Dick Shawn) ایک امریکی ایکٹر تھا۔ وہ فلم میں اور اسٹیج پر ہنسانے کا کردار ادا کرتا تھا۔ ۱۷ اپریل ۱۹۸۷ کی رات کو وہ کیلی فورنیا کے مقام لاجولا (La Jolla) میں ایک تھیٹر ہال کے اندر ایکٹنگ کر رہا تھا اور اپنی تفریحی باتوں سے لوگوں کو ہنسا رہا تھا۔ ہال کے اندر چھ سو تماشائی بیٹھے ہوئے اس کی تفریحی باتوں سے لطف لے رہے تھے۔ اس کی ایکٹنگ جاری تھی کہ اچانک وہ اسٹیج پر منہ کے بل گر پڑا۔ لوگوں نے سمجھا کہ یہ کوئی مذاق ہے جو اس نے اپنی ایکٹنگ کے جزء کے طور پر کیا ہے :

People thought it was a joke, part of the act.

ایکٹر اسی حال میں چند منٹ تک فرش پر پڑا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے لڑکے ایڈم (Adam) کو شبہہ ہوا۔ اس نے ایک ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے آکر دیکھا اور فوراً اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا۔ ایمبولنس کے ذریعہ اس کو اسپتال پہنچایا گیا۔ اسپتال کے ڈاکٹروں نے جانچ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ ڈک شان کا انتقال ہو چکا ہے۔ انتقال کا سبب غالباً دل کا دورہ (Heart attack) تھا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر ۵۷ سال تھی (ٹائمس آف انڈیا ۲۰ اپریل ۱۹۸۷)

اس دنیا میں کوئی شخص روتے ہوئے مرجاتا ہے اور کوئی شخص ہنستے ہوئے۔ کسی پر اس کی موت بدحالی میں آجاتی ہے اور کسی پر خوش حالی میں۔ کوئی خاک پر بیٹھا ہوا اس دنیا سے چلا جاتا ہے اور کوئی تخت حکومت پر۔ موت ایک ایسا انجام ہے جو ہر ایک پر آتا ہے خواہ وہ ایک حالت میں ہو یا دوسری حالت میں۔

مگر موت ہی وہ سب سے بڑی حقیقت ہے جس کو انسان سب سے زیادہ بھولا ہوا ہے یہاں رونے والا اور ہنسنے والا دونوں ایک ہی حال میں مبتلا ہیں۔ وہ صرف اپنے آج کو جانتے ہیں، وہ اپنے کل کو نہیں جانتے۔ اگر وہ اپنے کل کو جان لیں تو ہنسنے والے کا حال بھی وہی ہو جائے جو رونے والے کا حال نظر آرہا ہے۔

یہ سب سے بڑی بھول ہے جس میں آج کا انسان مبتلا ہے۔

ایک تاثر

ایک مجلس میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ ایک مسلمان شاعر نے اپنے نعتیہ کلام سے حاضرین کی تواضع کی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ایک قطعہ پڑھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ احد اور احمد دونوں ایک ہیں۔ یہ صرف "م" کا پردہ ہے جس کی وجہ سے دونوں بظاہر الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔ جب حشر برپا ہوگا اور حقیقتیں کھلیں گی تو یہ پردہ ہٹ جائے گا، اور پھر دونوں اس طرح ایک جیسے ہو جائیں گے کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا مشکل ہوگا۔ ایک شعر یہ تھا:

لوگ محشر میں حیران رہ جائیں گے خدا کون ہے، مصطفیٰ کون ہے

اسی طرح ایک مسلمان مقرر کا یہ حال تھا کہ جب وہ تقریر کرتے تو اپنی تقریر سے پہلے یہ جملہ کہتے: "سب کا خدا خدا ہے، میرا خدا احمد" یہ دونوں شعر غالی بدعتی کے الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ مگر جو لوگ بظاہر اس بدعت سے پاک ہیں، وہ اس سے بھی زیادہ بڑی بدعت میں مبتلا ہیں۔ بدعتیوں نے پیغمبر کو خدا کا درجہ دے رکھا ہے، اور دوسرے مسلمانوں نے اپنے اکابر کو۔ ایک اگر اپنے اس عقیدہ کو زبان قال سے دہرا رہا ہے تو دوسرا زبان حال سے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے بارہ میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ خدا پرست نہیں ہیں بلکہ انسان پرست ہیں۔ ان میں سے کوئی پیغمبر کو خدا کا درجہ دئے ہوئے ہے اور کوئی غیر پیغمبر کو۔ کوئی اپنے اکابر کی عظمتوں میں کھویا ہوا ہے۔ کسی کو اپنے رہنماؤں کا قد اتنا بڑا دکھائی دیتا ہے کہ اس کے آگے خدائی بلندیاں بھی چھوٹی ہوگئی ہیں۔ کسی کا یہ حال ہے کہ اس کو اپنے بزرگ اتنے زیادہ مقدس نظر آتے ہیں کہ ان پر خالص علمی اور دینی تنقید کرنا بھی کفر و فسق سے کم نہیں۔ حتیٰ کہ ان کے خلاف زبان کھولنا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے بعد آدمی کی جان اور مال اور آبرو سب ان کے لئے مباح ہو جائے۔

اگر حقیقت وہی ہو جو قرآن میں بیان کی گئی ہے تو قیامت لوگوں کے تصور سے کتنا زیادہ مختلف ہوگی، لوگ کن کن بڑائیوں میں گم ہیں، مگر جب قیامت آئے گی تو معلوم ہوگا کہ یہاں ایک خدا کے سوا کسی کو کوئی بڑائی حاصل نہ تھی۔ شاعر کا شعر کسی قدر تبدیلی کے ساتھ عین درست ہے:

لوگ محشر میں حیران رہ جائیں گے کہ تھی بات کیا، ہم نے سمجھا تھا کیا

دعوت اسلام

دین انسانیت

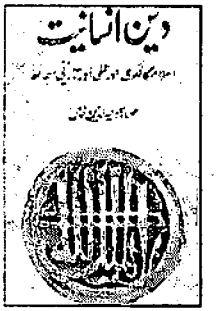

اللہ اکبر

اسلامی تعلیمات

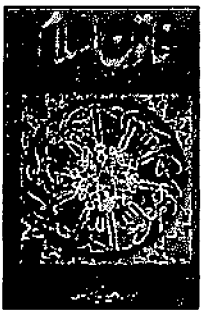

قال اللہ
وقال الرسول

اسلام
دور جدید کا خالق

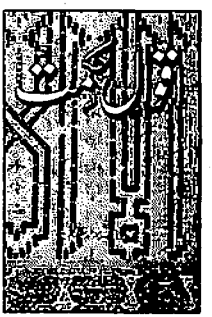

خاتون اسلام

سبق آموز واقعات

مطالعہ سیرت

صراط مستقیم

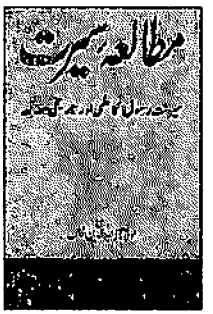

راہیں بند نہیں
مولانا وحید الدین خاں

پیغمبر اسلام

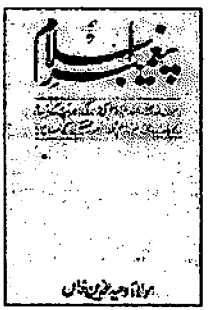

مذہب
اور
جدید چیلنج

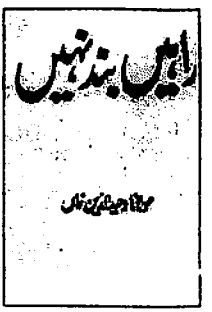

اسلامی زندگی

تذکیر القرآن

(مکمّل، نیا ایڈیشن)

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام وخواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ: ۴۰۰ روپے

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

Goodword Books

Tell Me About the Prophet Muhammad (HB)
Tell Me About the Prophet Muhammad (PB)
Tell Me About the Prophet Musa (HB)
Tell Me About Hajj (HB)
Tell Me About Hajj (PB)
Tell Me About the Creation
Honeybees that Build Perfect Combs
The World of Our Little Friends, the Ants
Life Begins: Quran Stories for Little Hearts (PB)
The Ark of Nuh (HB)
The Ark of Nuh (PB)
The First Man (HB)
The First Man (PB)
The Two Brothers (HB)
The Two Brothers (PB)
The Brave Boy
The Queen and the Bird
Allah's Best Friend
Tale of A Fish (PB)
The Travels of the Prophet Ibrahim (PB)
The Origin of Life (Colouring Book)
The First Man on the Earth (Colouring Book)
The Two Sons of Adam (Colouring Book)
The Ark of Nuh and the Animals (Colouring Book)
The Brave Boy (Colouring Book)
Allah's Best Friend (Colouring Book)
The Travels of the Prophet Ibrahim (Colouring Book)
The Ark of Nuh and the Great Flood (Sticker Book)
The Story of the Prophet Nuh (HB)
The Story of the Prophet Nuh (PB)
The Blessings of Ramadan (PB)
The Story of Prophet Yusuf (PB)
The Holy Quran (PB)
The Holy Quran (HB)
Islam Rediscovered
A Dictionary of Muslim Names
The Most Beautiful Names of Allah (HB)
The Most Beautiful Names of Allah (PB)
The Pilgrimage to Makkah
Arabic-English Dictionary for Advanced Learners
The Spread of Islam in the World
A Handbook of Muslim Belief
The Muslims in Spain
The Moriscos of Spain
The Story of Islamic Spain (PB)
Spanish Islam (A History of the Muslims in Spain)
A Simple Guide to Muslim Prayer
A Simple Guide to Islam
A Simple Guide to Islam's Contribution to Science
Islamic Medicine
Islam and the Divine Comedy
The Travels of Ibn Jubayr
The Travels of Ibn Battuta
Humayun Nama
The Arabs in History
Decisive Moments in the History of Islam
My Discovery of Islam
Islam At the Crossroads
The Spread of Islam in France
The Islamic Art and Architecture
The Islamic Art of Persia
The Hadith for Beginners
How Greek Science Passed to Arabs
Islamic Thought and its Place in History
Muhammad: The Hero As Prophet
A History of Arabian Music
A History of Arabic Literature
The Qur'an for Astronomy
Islamic Economics
The Quran
Selections from the Noble Reading
The Koran
Heart of the Koran
Muhammad: A Mercy to All the Nations
The Sayings of Muhammad
The Beautiful Commands of Allah
Allah is Known Through Reason
The Miracle in the Ant
The Miracle in the Immune System
The Miracle in the Spider
Eternity Has Already Begun
Timelessness and the Reality of Fate
Ever Thought About the Truth?
Crude Understanding of Disbelief
Quick Grasp of Faith
Death Resurrection Hell
The Basic Concepts in the Quran
The Moral Values of the Quran
The Beautiful Promises of Allah
The Muslim Prayer Encyclopaedia
After Death, Life!
Living Islam: Treading the Path of Ideal
A Basic Dictionary of Islam
The Muslim Marriage Guide
GCSE Islam–The Do-It-Yourself Guide
A Treasury of the Quran
The Quran for All Humanity
The Quran: An Abiding Wonder
The Call of the Qur'an
Muhammad: A Prophet for All Humanity
Words of the Prophet Muhammad
An Islamic Treasury of Virtues
Islam and Peace
Introducing Islam
The Moral Vision
Principles of Islam
Indian Muslims
God Arises
Islam: The Voice of Human Nature
Islam: Creator of the Modern Age
Woman Between Islam and Western Society
Woman in Islamic Shari'ah
Islam As It Is
Religion and Science
Tabligh Movement
The Soul of the Quran
Presenting the Quran
The Wonderful Universe of Allah
The Life of the Prophet Muhammad
History of the Prophet Muhammad
A-Z Steps to Leadership
The Essential Arabic
One Religion
The Way to Find God
The Teachings of Islam
The Good Life
The Garden of Paradise
The Fire of Hell
Islam and the Modern Man
Uniform Civil Code
Man Know Thyself
Muhammad: The Ideal Character
Polygamy and Islam
Hijab in Islam
Concerning Divorce
Search for Truth
The Concept of God
The Creation Plan of God
The Man Islam Builds
Non-Violence and Islam
Islamic Fundamentalism
The Shariah and Its Application
Spirituality in Islam
Islamic Activism
Islam Stands the Test of History
The Revolutionary Role of Islam
Islam in History
Conversion: An Intellectual Transformation
A Case of Discovery
Manifesto of Peace

RNI 28822/76 • U(SE) 12/2001
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/2001